معارف کا زر تعاون

ہندوستان میں سالانہ ساٹھ روپیے فی شمارہ پانچ روپیے

پاکستان میں سالانہ ایک سو پچاس روپیے

دیگر ممالک میں سالانہ ہوائی ڈاک پندرہ پونڈ یا چوبیس ڈالر

بحری ڈاک پانچ پونڈ یا آٹھ ڈالر

پاکستان میں ترسیل زر کا پتہ :۔ حافظ محمد یحییٰ شیرستان بلڈنگ

بالمقابل ایس ایم کالج۔ اسٹریچن روڈ۔ کراچی

- سالانہ چندہ کی رقم منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ کے ذریعہ بھیجیں۔ بینک ڈرافٹ درج ذیل نام سے بنوائیں :

DARUL MUSANNEFIN SHIBLI ACADEMY AZAMGARH.

- رسالہ ہر ماہ کی ۱۵ تاریخ کو شائع ہوتا ہے، اگر کسی مہینہ کے آخر تک رسالہ نہ پہونچے تو اس کی اطلاع اگلے ماہ کے پہلے ہفتہ کے اندر دفتر معارف میں ضرور پہونچ جانی چاہیے، اس کے بعد رسالہ بھیجنا ممکن نہ ہوگا۔
- خط و کتابت کرتے وقت رسالے کے لفافے کے اوپر درج خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیں۔
- معارف کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں کی خریداری پر دی جائے گی۔ کمیشن ۲۵٪ ہوگا ــــــ رقم پیشگی آنی چاہیے۔

معارف اعظم گڈھ

کی

۱۴۸ ویں جلد

ماہ جولائی ۱۹۹۱ء تا ماہ دسمبر ۱۹۹۱ء

(بہ ترتیب حروف تہجی)

نمبر شمار	مضمون نگار	صفحات	نمبر شمار	مضمون نگار	صفحات
۱	جناب ابوسفیان اصلاحی علی گڑھ	۳۱۳	۸	مولانا مسعود عالم قاسمی ناظم سنی دینیات علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ	۱۳۹
۲	ڈاکٹر سید احتشام احمد ندوی صدر شعبۂ عربی کالی کٹ یونیورسٹی	۴۱۶	۹	ڈاکٹر شرف الدین اصلاحی اسلام آباد، پاکستان	۴۵۵
۳	مولانا قاضی اطہر مبارکپوری مبارکپور، اعظم گڈھ	۴۵۸	۱۰	جناب سید شہاب الدین دسنوی بمبئی	۳۱۲
۴	حکیم الطاف احمد اعظمی جامعہ ہمدرد دہلی	۵۶	۱۱	ضیاء الدین اصلاحی	۸۵-۸۲-۲، ۱۶۵-۱۶۲، ۳۲۲-۲۴۳، ۳۹۱-۳۸۰، ۴۰۲
۵	ڈاکٹر انیس ادیب مئوناتھ بھنجن	۳۰۵	۱۲	مولوی عبد الرزاق ندوی رفیق دار عرفات رائے بریلی	۵
۶	جناب ا۔ و۔ شاکرہ صاحبہ وجیانگر کالونی حیدرآباد	۳۷۰	۱۳	جناب حکیم عبد الباری۔ صاحب جامعہ ہمدرد ہمدرد نگر نئی دہلی۔	۲۸۳-۲۴۴
۷	جناب رام لعل نابھوی صاحب نابھا، پنجاب	۲۹۶			

نمبر شمار	مضمون نگار	صفحات	نمبر شمار	مضمون نگار	صفحات
۱۴	حافظ عمیر الصدیق دریابادی ندوی رفیق دارالمصنفین	۴۳-۷۷، ۱۴۱-۱۴۵، ۱۴۷-۱۴۸، ۱۵۳-۲۲۶، ۲۳۷-۳۰۴، ۳۱۶-۳۸۴، ۳۹۷-۴۱۳، ۴۵۱-۴۷۶	۲۳	ڈاکٹر محمد یوسف الدین صاحب سابق صدر شعبۂ مذہب و ثقافت عثمانیہ یونیورسٹی، حیدرآباد	۳۹۴
			۲۴	پروفیسر محی الدین بمبئی والا احمدآباد	۴۷۴
۱۵	مولانا غلام محمد صاحب کراچی، پاکستان	۲۳۵	۲۵	پروفیسر مختار الدین احمد علیگڑھ	۳۸۹
۱۶	جناب کبیر احمد جائسی صدر شعبۂ علوم اسلامیہ علیگڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ	۱۲۳	۲۶	پروفیسر مقبول احمد کلکتہ	۴۷۳
۱۷	جناب کمال الدین عینی صاحب تاجک اکیڈمی آف سائنسز تاجکستان	۱۲۳	۲۷	جناب شیخ نذیر حسین صاحب مدیر اردو دائرہ اسلامیہ پنجاب یونیورسٹی لاہور پاکستان	۲۲۰-۲۷۲
۱۸	جناب لطیف اللہ صاحب کراچی، پاکستان	۲۴۵	۲۸	ڈاکٹر نور السعید اختر استاذ شعبۂ فارسی مہاراشٹر کالج بمبئی۔	۲۶
۱۹	ڈاکٹر محمد اجمل اصلاحی استاذ جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ۔	۲۱۴	۲۹	ڈاکٹر سید وحید اشرف کچھوچھوی پروفیسر و صدر شعبۂ عربی، فارسی، اردو، مدراس یونیورسٹی	۳۲۵-۴۰۵
۲۰	جناب محمد بدیع الزماں پھلواری	۴۴۴			
۲۱	محمد عارف اعظمی عمری رفیق دارالمصنفین	۱۴۹-۲۰۵	۳۰	ڈاکٹر سید یحییٰ نشیط قلعہ مسجد وارڈ واردھا	۱۰۲-۱۸۱
				شعراء	
۲۲	جناب محمد عبدالرحمن سعید صدیقی صاحب شکاگو، امریکا۔	۲۶۱، ۴۷۵	۱	جناب اثر انصاری مئوناتھ بھنجن	۱۵۲
			۲	جناب محمد عبدالرحمن سعید صدیقی شکاگو، امریکا	۴۷۵

فہرست

مضامین معارف

جلد ۱۴۸

ماہ جولائی ۱۹۹۱ء تا ماہ دسمبر ۱۹۹۱ء

(بہ ترتیب حروف تہجی)

نمبر شمار	مضمون	صفحات	نمبر شمار	مضمون	صفحات
	شذرات	۲-۸۲، ۱۶۲-۲۴۲، ۳۲۲-۴۰۲	۸	تحریک عصبۂ اندلسیہ کا ارتقاء	۴۱۶
	مقالات		۹	حکیم علی گیلانی ایک نامور طبیب اور ریاضی داں	۵۶
۱	اردو شاعری میں تخلص کی روایت	۳۷۵	۱۰	خواجہ حافظ شیرازی کی شاعری میں سلوک	۳۲۵-۴۰۵
۲	اردو کی مناجاتی شاعری	۱۰۲-۱۸۱			
۳	استاذ عبداللہ کنون (معاصر مراکشی عالم مورخ اور ادیب)	۲۲۰	۱۱	علامہ شبلی اور سیرت نبویؐ کی تالیف (مقدمۂ سیرت پر ایک نظر)	۸۵-۱۶۵
۴	اقبال کا نظریۂ عشق و خرد	۲۶۱	۱۲	غایۃ الامکان فی درایۃ المکان کا حقیقی مصنف کون ہے؟	۲۴۵
۵	امام ابو سعید اصطخری	۴۳۷			
۶	پنجاب میں فارسی ادب	۲۹۶	۱۳	فتح نامہ محمود شاہی پر ایک تحقیقی نظر	۲۶
۷	تاجیکستان میں ہندشناسی	۱۲۳	۱۴	فتح نامہ محمود شاہی پر ایک نظر کچھ معروضات	۳۷۰

نمبر شمار	مضمون	صفحات
۱۵	قدیم ہندوستان میں طب	۲۸۲-۳۴۴
۱۶	کچھ اسامہ بن منقذ کے بارے میں	۲۱۴
۱۷	مغربی تحقیقات کا منہج و اسلوب	۵
۱۸	موت کہتے ہیں جسے اہل زمیں کیا راز ہے۔	۴۴۴
۱۹	مولانا فراہی سمینار	۳۸۰
۲۰	ہجرت سے پہلے مدینہ کی درسگاہیں	۳۵۸
۲۱	ہندوستان کی سب سے پہلی تفسیر کاشف الحقائق و قاموس الدقائق	۲۰۵
	معارف کی ڈاک	
۱		۱۳۹-۳۱۲، ۳۱۳
۲	پروفیسر مختار الدین احمد علیگڑھ کا مکتوب گرامی	۳۸۹
۳	مکتوب احمد آباد	۴۷۴
۴	مکتوب کلکتہ	۴۷۳
۵	مکتوب لاہور	۴۷۲
۶	مولانا غلام محمد صاحب کراچی کا مکتوب گرامی	۲۳۵
	آثار علمیہ و تاریخیہ	
۱	اسلامی مملکت کے بنیادی اصول	۲۳۹

نمبر شمار	مضمون	صفحات
۲	عدالت میں مولانا حمید الدین فراہیؒ کا حلفی بیان	۴۵۵
	اخبار علمیہ	۷۳-۱۴۱، ۲۲۶-۳۰۸، ۴۴۳-۴۵۱
	وفیات	
	ڈاکٹر سید ابراہیم ندوی مرحوم	۱۴۷
	مولانا محمد احمد پرتاب گڈھی	۳۹۱
	مولانا محمد سلمان خاں بھوپالی ندوی مرحوم	۱۴۸
	مولانا محمد یوسف مرحوم	۱۴۵
	ادبیات	
	خمسۂ نعت	۴۷۵
	علامہ اقبال سہیل	۱۵۲
	باب التقریظ والانتقاد	
	احسن البیان فی علوم القرآن	۳۹۴
	المعرب من الکلام الاعجمی علی حروف المعجم	۱۴۹
	مطبوعات جدیدہ	۷۷-۱۵۳، ۲۳۷-۳۱۶، ۳۹۷-۴۷۶

جلد ۱۴۸ ماہ ذی الحجہ سنہ ۱۴۱۱ھ مطابق ماہ جولائی سنہ ۱۹۹۱ء عدد ۱

مضامین

شذرات	ضیاء الدین اصلاحی	۲-۴

مقالات

مغربی تحقیقات کا منہج و اسلوب	ترجمہ مولوی عبدالرزاق ندوی رفیق دار عرفات رائے بریلی	۵-۲۵
فتح نامہ محمود شاہی پر ایک تحقیقی نظر	ڈاکٹر نور السعید اختر استاذ شعبۂ فارسی مہاراشٹر کالج، بمبئی	۲۶-۵۵
حکیم علی گیلانی ایک نامور طبیب اور ریاضی داں	حکیم الطاف احمد اعظمی جامعہ ہمدرد دہلی	۵۶-۷۲
اخبار علمیہ	ع۔ ص	۷۳-۷۶
مطبوعات جدیدہ	ع۔ ص	۷۷-۸۰

بسم اللہ الرحمن الرحیم

شذرات

عام انتخابات کے بعد مرکز میں کانگریس آئی نے ڈیڑھ برس بعد جناب نرسمہاراؤ کی قیادت میں پھر حکومت بنائی ہے، لیکن کانگریس کو واضح اکثریت نہیں ملی ہے، اترپردیش اور بہار جیسی بڑی ریاستوں میں اسے عبرتناک شکست سے دوچار ہونا پڑا ہے، اس لیے اس کی حکومت کے گر جانے کا ہر وقت خطرہ ہے، اس کے علاوہ ملک جس نازک دور سے گذر رہا ہے اس میں بھی مستحکم حکومت کا امکان کم ہی ہے، اس کی معاشی حالت نہایت ابتر ہے، ڈیڑھ دو برس کے اندر ہر چیز کی قیمت دوگنا ہو گئی ہے، اقتصادی بحران اور بڑھتی ہوئی مہنگائی میں کرپشن کو بڑا دخل ہے سیاست میں تشدد پسندوں اور مجرمین کی حوصلہ افزائی، فرقہ واریت، مذہبی جنون اور علاقائی تعصب نے ملک کی سلامتی، استحکام، وحدت و یکجہتی اور امن و امان کو درہم برہم کر دیا ہے، ان حالات میں نرسمہاراؤ کے لیے وزارت عظمیٰ پھولوں کی سیج نہیں، کانٹوں کا تاج ہے۔

کانگریس نے انتخابی منشور میں اقتصادی مسئلہ کو اولیت اور زیادہ اہمیت دی تھی، اور سو روز کے اندر قیمتوں کو ڈیڑھ دو برس پہلے کی سطح پر لانے کا وعدہ کیا تھا، لیکن جن حالات سے ملک دوچار ہے ان میں یہ خواب و خیال ہی معلوم ہوتا ہے، سرمایہ داروں نے پورے ملک کو اپنی گرفت میں لے رکھا ہے، سیاسی پارٹیاں بھی ان کے چنگل سے آزاد نہیں ہیں، فرقہ پرستوں اور تشدد پسندوں نے کمزور اور بے سہارا طبقوں کی ناک میں دم کر رکھا ہے، انتظامی مشنری لوٹ گھسوٹ اور رشوت خوری میں لگی ہوئی ہے، عدالتوں میں بھی اس کی گرم بازاری ہے، ہر شعبۂ زندگی کی طرح معاشی بحران بھی بڑھتا ہی جا رہا ہے، ایسی صورت میں کانگریس کے پاس وہ کون سی جادو کی چھڑی یا علاء الدین کا چراغ ہے جس سے ملک کی یہ ساری لعنتیں دفعتہً ختم ہو جائینگی

کانگریس کو اپنی گزشتہ غلطیوں کی تلافی کے لیے قوم و ملک کی بے لوث خدمت کے لیے سرگرم عمل ہو جانا چاہیے، یہی اس کا خاص طرۂ امتیاز تھا، لیکن مسلسل اقتدار میں رہنے کی وجہ سے اس کے اندر

وہی سارے عیوب پیدا ہو گئے ہیں جو عام حکمرانوں کے اندر جب پیدا ہوتے ہیں تو انھیں زوال سے ہم کنار کر دیتے ہیں، نئی نسل کے کانگریسی کانگریس کے اصول و روایات اور خصوصیات و امتیازات سے بے خبر ہیں، انھیں نہ ملک کی سلامتی و وقار سے غرض ہے اور نہ عوام کی راحت و بھلائی سے مطلب، اگر کانگریس واقعی اپنی منفرد شناخت قائم کرنا چاہتی ہے تو اسے اپنا نیا لائحہ عمل تیار کر کے سرمایہ داروں کے استحصال، سیاست دانوں کے غلط طرز فکر و عمل اور انتظامیہ کی نااہلی اور بدعنوانی کے خلاف منظم تحریک چلانی چاہیے جس کی تصدیق صرف زبان ہی سے نہیں، بلکہ کانگریسیوں کے عمل سے بھی ہونی چاہیے، کرسی و اقتدار سے بے نیاز ہو کر فرقہ پرستوں کے معاملہ میں نرمی اور کمزوری چھوڑ دینا اور ملک و قوم کے وسیع تر مفاد میں ذاتی اور پارٹی کے مفاد کو نظر انداز کر دینا چاہیے، اسی طرح وہ پُر امن اور خوش حال ہندوستان کی تعمیر کر سکے گی، اس میں وقت لگے گا اور قربانیاں بھی دینی ہوں گی، لیکن ملک کی تعمیر و ترقی کا صحیح راستہ یہی ہے، گاندھی جی کے بقول مقصد کی طرح اس کے حصول کے ذرائع و وسائل بھی بلند اور بہتر ہونے چاہئیں۔

نئے انتخاب کے بعد ملک کی سب سے بڑی ریاست اترپردیش کی زمام کار بھارتیہ جنتا پارٹی کے ہاتھوں میں آگئی ہے، یہ ریاست بھی انہی سنگین مسائل سے دوچار ہے جو پورے ملک کو درپیش ہیں، غالباً اسی لیے اور باتوں کے علاوہ نئے وزیر اعلیٰ نے ریاست کو صاف ستھری حکومت دینے، امن و قانون کی صورت حال بہتر بنانے، معاشی استحکام پر فوری توجہ دینے، تمام شہریوں کے جان و مال، زندگی و جائیداد کے تحفظ، اقلیتوں کی سلامتی و وقار کی ضمانت دینے، ریاست کو فرقہ وارانہ فسادات سے پاک کرنے اور مجرمانہ سیاست کو ختم کر دینے کا عزم ظاہر کیا ہے اور کہا ہے کہ تمام فرقوں کے مذہبی جذبات کا احترام کیا جائے گا، اور کسی کے ساتھ ذات اور فرقے کی بنیاد پر امتیاز نہیں کیا جائے گا، وزیر اعلیٰ اور ان کی پارٹی کے سرکردہ لیڈر مسٹر اٹل بہاری باجپئی نے کہا ہے کہ ان کی پارٹی کی حکومت کے دوران میں مسلمان اس طرح محفوظ رہیں گے

جن کی مثال ہندوستان کی تاریخ میں نہیں ملے گی، ان کے ذہنوں سے عدم تحفظ کا احساس نکال دیا جائے گا، وزیر اعلیٰ نے یہ بھی کہا ہے کہ اسے ہم اپنے عمل سے ثابت کریں گے۔

ان جذبات کی کون قدر نہ کرے گا، لیکن یہ عمل کی کسوٹی پر پورے نہیں اترتے، یہاں نہ مسلم اقلیت کے بارے میں بی۔ جے۔ پی کے پچھلے رویے کو زیر بحث لانا ہے اور نہ مسلمانوں کے ساتھ کیے جانے والے اس برتاؤ کا ذکر مقصود ہے جو بعض ریاستوں میں اس کی حکومت کے دوران میں ہوا، عرض یہ کرنا ہے کہ بی جے پی کے لیڈر خواہ کچھ کہیں وہ رام مندر کے نام پر ہندوؤں کے جذبات کو بھڑکا کر ہی برسر اقتدار آئی ہے اور اب بھی وہ اسی سے سیاسی فائدہ اٹھانا چاہتی ہے، اس کے وزیروں نے حلف لیتے وقت جے سیارام کے نعرے لگائے اور حلف لینے کے بعد سکریٹریٹ کا رخ کرنے کے بجائے شری رام کی مورتی کا درشن اور پوجا کرنے کے لیے اجودھیا پہونچ گئے اور رام کی قسم کھا کر وہیں مندر بنانے کا عہد کیا، کیا یہ سب ملک کی سیکولر اور جمہوری روایات اور اسکے آئین و دستور کے مطابق اور حق و انصاف پر مبنی ہے، اور کیا مسلمانوں کے بے نظیر تحفظ اور انکے مذہبی جذبات کے احترام کا اقتضاء یہی ہے کہ ان کی کئی سو برس پرانی مسجد کو ثبوت و دلیل کے بغیر حکومت و اقتدار کے نشے میں جبرًا مندر میں تبدیل کر دیا جائے؟

بی جے پی کے لیڈر بابری مسجد کے مسئلہ پر متضاد بیانات دے رہے ہیں، کبھی مذاکرات کو اولیت دینے پر زور دیتے ہیں، کبھی مسلمانوں سے اپنا موقف تبدیل کر لینے کا مطالبہ کرتے ہیں، کبھی مندر کی تعمیر کے لیے قانونی راہ ہموار کرنے کی بات کرتے ہیں، کبھی کہا جاتا ہے مرکزی سرکار کا تعاون ناگزیر ہے، کبھی کہا جاتا ہے وشو ہندو پریشد مندر تعمیر کرائے گا اور کبھی کہتے ہیں کہ مندر ہر حال میں بی جے پی کے پانچ سالہ دور اقتدار میں بن کر رہے گا، صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اس مسئلہ کو ہوا دے کر وہ اپنی حکومت کو باقی رکھنا اور آیندہ مرکز پر بھی قابض ہونا چاہتی ہے، کیا ایسی حکومت سے یہ توقع کی جا سکتی ہے کہ وہ لوگوں کے بنیادی مسائل کو حل کرے گی، امن و قانون کی صورت حال کو بہتر بنائے گی اور اقلیتوں کو بے مثال تحفظ فراہم کرے گی؟

مقالات

مغربی تحقیقات کا منہج و اسلوب

از ڈاکٹر عبد العظیم محمود الدیب[۱] — مترجمہ مولوی عبد الرزاق ندوی[۲]

خیال تھا کہ مستشرقین کے بارے میں اس قدر لکھا جا چکا ہے کہ ہمیں ان کے معاملہ میں مزید دماغ سوزی اور تحقیق کی ضرورت باقی نہیں رہ گئی ہے کیونکہ ان کی بحث و تحقیق اور علمی کد و کاوش اور اسلام اور اسلامی تاریخ و تہذیب پر ان کے اعتراضات کی قلعی پوری طرح کھولی جا چکی ہے اس لیے مسلمان فضلاء و مفکرین کی بحث و تحقیق کا دائرہ اسلامی افکار و مسائل ہی تک محدود رہے گا اور وہ یکسوئی کے ساتھ ملت اسلامیہ اور ممالک اسلامیہ کی زبوں حالی، ذہنی علمی، فکری اور تہذیبی و اجتماعی انحطاط کی طرف خاطر خواہ توجہ دیں گے۔

مگر اس وقت علم و سائنس اور ٹکنالوجی میں مغربی قوموں کی برتری کی وجہ سے جو نت نئے انکشافات اور حیرت انگیز ایجادات ہو رہے ہیں ان کی وجہ سے خود مسلمان دانشور بے دھڑک یہ کہنے لگے ہیں کہ "مستشرقین ہی نے ہماری قوم کو جہالت کے دلدل سے نکالا اور گمراہی و ضلالت سے بچایا ہے"۔ اس لیے جب کوئی ان پر تنقید کرتا ہے تو یہ لوگ نہایت برہمی ظاہر کرتے ہیں۔

مستشرقین اور مغربی علوم و افکار کی بالاتری کی یہ مدح سرائی اور اسلام

---

(۱) صدر شعبہ فقہ و اصول شریعت ۔ قطر یونیورسٹی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

(۲) رفیق دار عرفات ۔ رائے بریلی۔

اسلامی تاریخ و تہذیب کے نقص و عدم کمال کا یہ اظہار چونکہ ہمارے ان بھائیوں کی جانب سے ہو رہا ہے جو ذہنی و فکری حیثیت سے مغربی طلسم کے اسیر اور اسکی ظاہری چمک دمک سے مرعوب ہیں، یہ لوگ گو ہماری ہی قوم و ملت کے فرزند ہیں؛ ہماری زبان بولتے ہیں۔ ان کے خط و خال بھی ہمارے ہی جیسے ہیں، لیکن ان کے دل ہم جیسے نہیں ہیں، وہ تہذیبی و ثقافتی طور پر ہم سے جدا ہو کر خارجی تہذیب کے آغوش میں جا چکے ہیں، اس لیے آئندہ سطور میں جو کچھ عرض کیا جائے گا اس کا روئے سخن انھی فرزندان ملت کی طرف ہے۔

یہ واضح کرنے کی ضرورت اس لیے پیش آئی تاکہ یہ نہ کہا جائے کہ "مستشرقین کے مسئلہ میں سر کھپانے اور انہیں برا بھلا کہنے میں ہم اپنی قوت و قابلیت اور وقت کو کیوں بلا وجہ صرف کر رہے ہیں، ہماری توانائی اور توجہ کی اصل مستحق تو خود ہماری ہی قوم و ملت ہے جو ہر قسم کے پیچیدہ مسائل اور گوناگوں مشکلات میں گرفتار ہے۔

دراصل سب سے بڑا المیہ ہمارے یہی مغرب زدہ لوگ ہیں جو بلا ضرورت اور بغیر سوچے سمجھے اپنی ہی قوم کے علوم و فنون اور اپنے ہی علمی ورثہ کو جو پورے طور پر مکمل و جامع ہے۔ تمسخر، استہزا اور استخفاف کا ہدف بنا رہے ہیں اس سے بھی خطرناک چیز وہ ثقافتی دہشت گردی ہے جس میں یہ حضرات بڑی بے غیرتی اور ڈھٹائی سے مصروف ہیں، اس کے لیے ان لوگوں نے "قدیم و جدید" "تقلید و تجدید" "ترقی و انحطاط" "جمود و آزادی" "تحفظ و روشن خیالی" "نئی تہذیب و پرانی تہذیب" جیسے الفاظ و مصطلحات ایجاد کر لی ہیں۔

اس بنا پر مستشرقین کے مقصد و منہج کی خرابی آشکارا کرنے کے لیے ہم مجبور ہیں۔

ہم اس خوش فہمی میں مبتلا نہیں ہیں کہ اس کی وجہ سے مغرب زدہ حضرات راہ راست پر آجائیں گے، یا ان کے دل و دماغ پر لگا ہوا زنگ صاف ہو جائے گا اور ان کی مرعوبیت ختم ہو جائے گی البتہ ہم کو تھوڑی بہت امید اپنے ان نوجوانوں اور فرزندوں سے ضرور ہے جو ابھی اپنی راہ کی تلاش وجستجو میں سرگرداں ہیں، اپنی اس نئی نسل اور نوجوانوں کو اصل حقیقت سے واقف کرا دینا ضروری ہے تاکہ انہیں وہ لوگ دھوکہ نہ دے سکیں جو خنجر مغرب سے گھائل اور افکار مغرب کی طرف مائل ہیں جو گذشتہ ڈیڑھ صدیوں سے ہماری قوم کو پستی کی طرف ڈھکیلنے پر تلے ہوئے ہیں۔ اگر اس امت کی بنیاد مضبوط و پائدار نہ ہوتی اور اس میں اپنی ذاتی قوت و طاقت نہ ہوتی تو یہ بھی ان مغرب زدہ لوگوں کی طرح مسخ ہو چکی ہوتی۔ لیکن ارادۂ الٰہی سے یہ امت ہر مسخ و بگاڑ سے محفوظ رہے گی۔ آئندہ ان شاء اللہ اس کا علم بلند ہوگا اور اس کا پیغام جو آسمانی ہے خدا اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے وعدوں کے مطابق ہر سو عام ہوگا۔

مستشرقین کے اغراض و مقاصد

ایک اندازہ کے مطابق انیسویں صدی سے بیسویں صدی کے نصف تک کی مختصر مدت میں مستشرقین نے ساٹھ ہزار کتابیں لکھیں، قابل غور مسئلہ یہ ہے کہ یہ سارا اہتمام اور اتنی زیادہ کد و کاوش کس لیے کی گئی ہے؟ اسلام، تاریخ اسلام، عقائد اسلام، فرق اسلام، فقہ اسلام، نبی اسلام، اور دیگر اسلامی موضوعات پر اتنی بڑی تعداد میں کتابیں لکھنا کوئی معمولی اور آسان کام نہیں، سوال یہ ہے کہ آخر یہ ساری جد و جہد و تگ و دو کیوں کی گئی۔

اس کے صرف دو مقاصد ہیں۔

۱۔ پہلا مقصد یہ ہے کہ آفتاب اسلام کی ضیائے مبین سے مغربی ذہن و دماغ کو متاثر و مرعوب ہونے سے بچایا جائے، اسلام پر ایمان لاکر اس کا علم بردار اور سپاہی و مجاہد بننے سے روکا جائے، جیساکہ اس سے قبل مصر و شام اور شمالی افریقہ و اسپانیہ میں ہوچکا ہے کہ جب دین اسلام ان ممالک میں داخل ہوا تو وہاں کے عیسائی دین اسلام میں فوج در فوج داخل ہوکر دین حنیف کے داعی و حامی بن گئے تھے علامہ محمود شاکر لکھتے ہیں:

"ایک عجیب انوکھی بات یہ پیش آئی کہ ان نومسلم عیسائیوں نے اپنی مادری وملکی زبان کو ترک کرکے عربی زبان کو اچھی طرح اپنا لیا اور اس سے بھی حیرت کن واقعہ یہ پیش آیا کہ ان نومسلموں کی نسل سے بڑے بڑے علماء و فضلا اور علم و فن کے ایسے عبقری پیدا ہوئے جنھوں نے اپنی جان و مال اور تیغ و قلم سے دین اسلام کی حمایت کی اور راہ خدا میں جہاد کیا۔"[1]

اسلام کو مسخ کرنے کا جذبہ ہی عیسائی علماء کو ہر وقت اسلام کے خلاف ریشہ دوانی میں مصروف و متحرک رکھتا ہے۔

۲۔ استشراق کا دوسرا مقصد مشرق سے واقفیت اور اس کا مطالعہ ہے وہ یہاں کی ہر چیز کو جاننے اور پرکھنے کی کوشش میں لگے رہتے ہیں، تاکہ یہاں ان کے اثر و نفوذ میں اضافہ ہو۔ صدیوں عالم اسلام ان کے لیے خوف، گھبراہٹ اور ہیبت کا بند قلعہ بنا رہا۔ جس میں گھسنے کی ہمت مدتوں شکست خوردہ

[1] محمود محمد شاکر "رسالة فی الطریق إلی ثقافتنا" ص ۵۷۔

صلیبیوں کو نہیں ہوئی، ان سے جو جنگیں ہوئیں وہ سب اسلام کی فتح و فیروزمندی اور مسیحیت کی شکست فاش پر ختم ہوئیں۔ چنانچہ جب چھٹی صدی ہجری کی ابتدا میں خونخوار صلیبیوں نے عالم اسلام پر چڑھائی کی کوشش کی تھی تو دو صدیوں تک (۴۸۹-۶۹۰) برسرپیکار رہنے کے باوجود انہیں مغلوب و مقہور ہوکر راہ فرار اختیار کرنی پڑی تھی مگر اس کے بعد بھی وہ اسی فکر و تدبیر میں لگے رہے اور پسپائی اور ناکامی نے بھی ان کو اس جانب سے غافل نہیں رکھا۔ صلیبیوں کو اپنے منصوبے کی تکمیل میں مستشرقین سے کافی مدد ملی۔

مستشرقین کی زندگی اسی جہاد اکبر کے لیے وقف رہی اور انھوں نے ایسے وقت میں بھی اپنے لیے گمنامی اور افلاس کی زندگی کو اختیار کرنا پسند کیا۔ جب پورے یورپ میں دولت و ثروت اور عزت و شہرت کے اسباب پیدا ہوگئے تھے مگر گوشہ عزلت میں بیٹھ کر انھوں نے اپنے آپ کو ان بوسیدہ کتابوں کے انبار میں مقید و محبوس کرلیا تھا جو اجنبی زبانوں میں لکھی گئی تھیں۔ اس وقت ان کے دلوں میں حقد و حسد اور نفرت و عداوت کے وہی شعلے بھڑک رہے تھے جو قسطنطنیہ کے آغوش اسلام میں آجانے کے نتیجے میں پورے یورپ میں بھڑک رہے تھے۔[1]

مستشرقین ہی میں سے کچھ لوگوں نے عالم اسلام کے گذشتہ حوادث و واقعات کی روشنی میں مستقبل کے اندیشوں کو بھانپ لیا تھا، وہ علماء و عوام دونوں کے عادات و اطوار، طریقہ زندگی اور انداز فکر وغیرہ سے اچھی طرح

[1] محمود محمد شاکر "رسالة فی الطریق إلی ثقافتنا" ص ۳۰،۴۷۔

موافق ہوگئے تھے، کرۂ ارض میں پھیلے ہوئے اسلامی ممالک کے بارے میں مستند معلومات بھی ان کے ریکارڈ میں آگئی تھیں، جن کا وہ باقاعدہ اور بغور مطالعہ کرتے تھے اس لیے مستشرقین کو اپنی قوم کے علماء و ماہرین سیاست سے لے کر عام لوگوں کا بھی پورا اعتماد حاصل تھا، وہ جو کچھ بھی لکھتے یا کہتے اسے پوری قوم تسلیم کرلیتی تھی، مستشرقین کی اس باخبری اور تجربہ و واقفیت نے آئندہ جنگ میں ان کی پوری رہنمائی کی اس لیے یورپ کے غلبہ و تسلط کا راستہ انہیں نے ہموار کیا۔ اس کی تائید حوادث و وقائع اور اہل صلیب و عالم اسلام کے مابین ہونے والی کشمکش و آویزش کے مختلف ادوار و مراحل کو دیکھتے ہوئے اور ماضی بعید و ماضی قریب کی تاریخ کے ارشادات سے مذکورہ باتوں کو ہم صحیح نتائج قرار دینے میں سو فیصد حق بجانب ہیں، اس لیے کہ اس کی تصدیق و توثیق مستشرقین نے خود اپنی زبان سے کردی ہے۔ ایک امریکی مستشرق "مسٹر رابرٹ بان" کے بیان سے بھی ہوتی ہے وہ اپنی مشہور کتاب "مقدس تلوار" کے مقدمہ میں تحریر کرتے ہیں:

"عربوں کو جاننے اور ان کے طور طریق کو سمجھنے کے ہمارے پاس کافی اور قوی اسباب موجود ہیں، اس میں کوئی شک نہیں کہ اس سے پہلے وہ پوری دنیا پر اپنا تسلط و بالاتری قائم کر چکے ہیں، اب پھر دوبارہ وہ اس کی تیاری کر رہے ہیں، محمدؐ نے ان کے دلوں میں جو آگ بھڑکائی تھی وہ اب بھی پوری طرح شعلہ زن ہے جو آئندہ بھی بجھنے والی نہیں۔"[1]

---

[1] بحوالہ محمد قطب "مذاہب فکریہ معاصرہ" ص ۵۹

اس سے بھی زیادہ صراحت و وضاحت کے ساتھ "شاہزادہ یستانی" نے لکھا، اٹلی کے اسی شہزادہ نے اپنی جیب خاص سے فرزندان مسیح کے تین قافلے تیار کیے، تاکہ وہ عالم اسلام کے مختلف علاقوں کا دورہ کریں، وہاں کے جغرافیائی حالات معلوم کریں۔ علاوہ ازیں انھوں نے سفرناموں اور رپورٹوں میں مذکور عالم اسلام کے حوادث و واقعات اور معلومات کو بھی ایک جگہ جمع کیا اور نو ضخیم جلدوں میں "حولیات اسلام" کے نام سے اس کا خلاصہ مرتب کیا جو چالیس ہجری تک کی اسلامی فتوحات کی تاریخ ہے، اس عظیم مہم کو سرانجام دینے کے لیے انھوں نے اپنا سارا اثاثہ لگا دیا اور غربت و افلاس سے دوچار ہوئے، وہ اپنی اس کاوش کا مقصد بتاتے ہوئے "حولیات اسلام" کے مقدمہ میں لکھتے ہیں ان کی یہ کوشش و کاوش صرف اس لیے ہے تاکہ اسلام کی موجودہ زبوں حالی کے اسرار و رموز تک رسائی ہوسکے، جس نے دنیا کے مختلف گوشوں میں دین مسیح کے لاکھوں پیرو کاروں کو ہم سے چھین لیا ہے جس کے ماننے والے اب بھی محمدؐ کے پیغام پر ایمان رکھتے ہیں اور انہیں رسول و نبی مانتے ہیں[2] گویا اسلام کے اسرار و رموز تک رسائی اور اس کی قوت و طاقت کے سرچشمہ کو معلوم کرنا ہی اٹلی کے اس شاہزادہ کا اصلی مقصد تھا۔

اسی طرح ایک جرمن مستشرق "مسٹر پال شمتز" نے "اسلام مستقبل کی عالمی طاقت" کے عنوان سے ایک کتاب لکھی ہے جس میں انھوں نے اسلام اور عالم اسلام کی پوشیدہ طاقت و قوت کے عناصر کو پیش کیا، اس کتاب کی تالیف اور اپنی

---

[2] تراثنا فی المشرق والغرب مولفہ بنت الشاطی۔

بحث وتحقیق کی غایت وہ یہ بتاتے ہیں، "اس کا مقصد اس غافل یورپ کی چشم کشائی ہے، جو ابھی تک اسلام کی اس قوت کا منہ سے بے خبر ہے جو یورپ کے لیے ایک سخت خطرہ ہے جس کے نعرے اب اس کے گوشہ گوشہ میں گونج رہے ہیں اور اسے اس کے مقابلہ کے لیے مل کر اٹھ کھڑے ہونے کی دعوت دے رہے ہیں۔"

کتاب کے ناشر لکھتے ہیں "یہ کتاب شعلہ کی طرح بھڑکتے ہوئے اس خطرہ کو آشکارا کرتی ہے جس سے یورپ کا انسان بڑی سادگی وبے پرواہی سے گذر جاتا ہے اور اس کی طرف توجہ نہیں کرتا کہ اب اہل اسلام مغرب کی دشمنی میں مغرب سے مقابلہ کے لیے مجتمع ہو رہے ہیں، یہ کتاب ایک دعوت ہے، ایک انتباہ ہے، جسے صرف مغرب کے مفاد ومصالح کے لیے مقبول عام وخاص ہونا چاہیے"[3]

اسی معنی ومفہوم کو "مسٹر البرشا میڈز" نے اپنی کتاب "حمرا غرناطہ" میں دہرایا ہے، غرناطہ میں اسلامی آثار کی عظمت وشوکت کو بیان کرنے کے بعد موصوف لکھتے ہیں، "اس میں کوئی شک نہیں کہ ذہین اور بہادر عرب سنتّر سال کے اندر دنیا کے علم وفن کو جمع کرنے میں کامیاب ہو گئے، اسی کے ساتھ ہی انھوں نے اسی عرصہ میں نصف عالم کو بھی فتح کر لیا اور اپنے علم وفن کے آثار ہمارے لیے غرناطہ میں چھوڑ گئے، بے شک عرب جو صدیوں تک خواب غفلت میں پڑے رہے، اب اچانک پھر بیدار ہو گئے ہیں اور نہیں کہا جا سکتا کہ کس دن پورا یورپ عربوں کی زد میں آجائے"۔ آگے پھر لکھتے ہیں کہ "میں نبوت کا دعویٰ تو نہیں

[3] ڈاکٹر محمد البہی کے مقدمہ ص ۱۱ سے ماخوذ ہے۔

کرتا لیکن بہت سے دلائل وقرائن ایسے موجود ہیں جو ان احتمالات کو یقین میں تبدیل کر دینے والے ہیں۔ اگر واقعی ایسا ہوا تو پھر انکے بلاخیز طوفان کو ایٹم روک سکتا ہے نہ راکٹ،

اس کے بعد فاضل مصنف نے بڑے پُرزور انداز میں یہ اپیل کی ہے کہ "حمرا سے عربوں کے نام ونشان تک مٹا ڈالو، ان کے بیدار ہونے سے پہلے ہی ان کو نیست ونابود کر دو، آخر میں بڑی حسرت سے کہتے ہیں کہ "کاش ہم ایسا کر سکتے"

یہ مقاصد واغراض خود مستشرقین کے بیان کردہ ہیں جن کے بعد بھی ہماری ملت کے سادہ لوح حضرات ان کی اور ان کی تحقیقات کی تعریف میں اس طرح رطب اللسان ہیں کہ یہ خالص علمی وفکری وغیرجانبدارانہ ہوتی ہیں۔ اور وہ اسی پر اکتفا نہیں کرتے بلکہ پھر ان کی تعریف وتوصیف میں کتابیں اور مقالات بھی لکھتے رہتے ہیں، ہماری نئی نسل کو بھی وہ اسی کی تلقین کرتے رہتے ہیں اس موقع پر مسٹر رجا جارودی کا ایک بیان نقل کرنا نامناسب نہ ہوگا وہ ایک عظیم فلسفی، مذہب وجودی کے رہنما، سارٹر کے سحر وفسوں کے مفسر اور کمیونسٹ پارٹی کی قیادت کے امیدوار تھے، فرماتے ہیں کہ "ابتدا ہی سے استشراقی تحریک پاکدامن وغیرجانبدار نہیں تھی، اس کا اصل مقصد اس منصوبہ واسکیم کو نافذ کرنا تھا جس کی بدولت زیادہ سے زیادہ مسلمانوں کو نصرانیت میں داخل کر دیا جائے"[1]

جب ہم اپنے ان مغرب زدہ بھائیوں کے سامنے مستشرقین کے ان اغراض ومقاصد کو آشکارا کرتے ہیں اور اس بات کی واضح شہادتیں پیش کرتے ہیں کہ

[1] مبشرات الاسلام: از رسالہ "الامۃ" عدد ۲۴ ص ۲۳۔

یہ تحقیق، معروضیت اور علمی منہج و اسلوب کے منافی ہیں تو اس وقت خود ہمارے ہی بھائی چیخنے اور چلانے لگتے ہیں کہ "آپ لوگوں کو یہ کیا ہو گیا ہے کہ گھسی پٹی پامال باتوں کے درپے ہیں؟ یہ سب باتیں انیسویں صدی بلکہ اس سے بھی پہلے کی ہیں جب استعمار کا بول بالا اور مشرق و مغرب کے درمیان کشمکش و آویزش برپا تھی، لیکن بیسویں صدی کے آغاز ہی سے مستشرقین کی تحقیقات کے انداز و آہنگ بدل گئے ہیں، اب ان کا کام خالص علمی طرز پر ہونے لگا ہے اور ان کی بحث و تحقیق اسی رنگ میں رنگی ہوتی ہے، وہ صرف علم و معرفت کے دلدادہ اور علمی کاوش میں سرگرم عمل رہتے ہیں، اب اسلام، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، قرآن مجید، اسلامی تاریخ، اسلامی عقائد اور اسلامی تہذیب پر ان کے حملوں کا دور ختم ہو چکا ہے اور انھوں نے مخلصانہ علمی جدوجہد کو اپنا وطیرہ بنا لیا ہے۔

اس حد تک تو صحیح ہے کہ اب مستشرقین کی تحقیقات سب وشتم اور اسلام اور مسلمانوں کی تقبیح و تشنیع سے خالی ہوتی ہیں، لیکن یہ خیال کرنا کہ اب وہ علمی منہج، غیر جانبدارانہ بحث و تحقیق اور خالص معروضی اصول و قواعد کے خوگر ہو گئے ہیں سراسر غلط ہے، پہلے ہی کی طرح اب بھی صحیح علمی منہج اور معروضی تحقیق کے التزام اور غیر جانبدارانہ انداز میں علم و فن کی خدمات انجام دینے سے وہ بہت دور ہیں، اسکے متعدد اسباب ہیں جن کو آگے مناسب موقع پر بیان کیا جائے گا۔

اس سے پہلے بعض معاصر مستشرقین کے اقوال پیش کیے جا چکے ہیں جن سے اس خیال کی مکمل تردید ہوتی ہے، ذیل میں ڈاکٹر جلوور کا ایک بیان نقل کیا جاتا ہے وہ اپنی کتاب "نقد ما التبشیر العالمی" (عالمی مشنری کا ارتقاء) مطبوعہ سنہ ۱۹۷۰ء میں

لکھتے ہیں:

"محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی شمشیر اور قرآن ہمارے سب سے بڑے دشمن ہیں اور ہماری تہذیب و ثقافت نیز حق و حریت کے سب سے بڑے مخالف محمد وہ شکست و رجعت اور تباہی و بربادی کے سب سے بڑے خطرناک عوامل ہیں... قرآن حقائق و خرافات، حقیقت و افسانہ کا عجیب مجموعہ اور تاریخی اغلاط و فاسد اوہام کا ایک معجون مرکب ہے، اس کے علاوہ وہ غامض، پیچیدہ اور ہماری سمجھ سے بالاتر ہے،... محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ایک مطلق العنان حاکم تھے، وہ عوام کے لیے بادشاہ کی خواہشات کی پیروی کو ضروری قرار دیتے تھے ان کے نزدیک بادشاہ جو چاہے کر سکتا ہے یہی وجہ ہے کہ وہ خود ہر اس شخص کی گردن اڑا دیتے تھے جو ان کی مرضی کے خلاف کام کرتا تھا ان کی فوج تسلط و اقتدار اور دہشت گردی کی عادی تھی جس کو اس کے رسول نے یہ ہدایت کی تھی کہ جو میری پیروی نہ کرے یا میری راہ سے روگردانی اختیار کرے اس کی گردن اڑا دے"[1]

اسلام کے متعلق مستشرقین کی بے بضاعتی کا اندازہ نو مسلم مستشرق محمد اسد (لیوپولڈ فائس) کی اس تحریر سے بھی کیا جا سکتا ہے وہ لکھتے ہیں:

"اسلام کے متعلق یورپین حضرات کا موقف صرف ناپسندیدگی و بے پروائی تک ہی محدود نہیں ہے جیسا کہ دوسرے مذاہب و ادیان سے ان کا سلوک ہے بلکہ اسلام کی دشمنی و ناپسندیدگی ان کی رگ و جاں میں پیوست ہے،

---

[1] تطور الموقف العربی عن السیرۃ مؤلفہ عماد الدین خلیل ج ۱ ص ۱۲۸۔

جو اکثر اوقات شدید تعصب کا رنگ اختیار کرلیتی ہے، در اصل ان کی کراہت
وعداوت محض عقلی نہیں بلکہ شدید طرح کی جذباتی بھی ہے"۔

حقیقت یہ ہے کہ اہل مغرب اسلام کا نام سنتے ہی اپنا ذہنی توازن کھو بیٹھتے ہیں
اور شدید قسم کے جذباتی ہیجان میں مبتلا ہو جاتے ہیں اسی لیے مشہور و ممتاز مستشرقین
بھی اس بارے میں غیر جانبداری پر قائم نہیں رہ سکے ہیں۔ ان کی نظر میں پہلے ہی سے
اسلام کی حیثیت ایک مجرم کی ہوتی ہے جس کے جرائم کو ثابت کرنے کے لیے بعض لوگ
مدعی بن جاتے ہیں اور کچھ لوگ وکیلوں کی طرح اس کا دفاع بھی کرتے ہیں جو اپنے
موکل کے جرم پر اطمینان کے باوجود شخصی طور پر اس کا استخفاف کرتے ہیں چنانچہ
محمد اسد رقمطراز ہیں" مختلف تہذیبوں اور ثقافتوں کے علاوہ صرف اسلام ہی ایک
ایسا مذہب ہے جس کے ساتھ مغربی مطالعہ نے یہ غیر منصفانہ سلوک روا رکھا ہے"
لہذا اسلام پر جب وہ لکھنے پر آتے ہیں تو موروثی تحقیر و تذلیل کا جذبہ غیر معقول گروہی
شکل میں ان کے علمی و تحقیقی کاموں میں سرایت کرنے لگتا ہے، یورپ اور عالم اسلام
کے مابین تاریخ نے جو خلیج کھود دی تھی اس پر اب تک کوئی پل تیار نہیں کیا جا سکا ہے
اور اب تو اسلام کی تحقیر و تذلیل یوروپین فکر و سوچ کا اساسی جز بن چکی ہے،

ابتدائی مراحل میں مستشرقین عیسائی مشنری کی حیثیت سے عالم اسلام کو
اپنی جولان گاہ بنائے ہوئے تھے اور انھوں نے اس وقت اسلامی تعلیمات اور اسلامی
تاریخ کو مسخ کرنے کا کام ایک منصوبہ بند اسکیم کے تحت انجام دیا لیکن بعد میں استشراقی
تحریک مشنریوں کے پنجہ سے آزاد ہوگئی، لہذا اب ان کی عدم عصبیت اور غیر جانبداری
کے لیے کسی طرح کا عذر پیش کرنا مناسب نہیں ہے۔

مذہب اسلام پر مستشرقین کا حملہ اور طعن و تشنیع انکی ایسی موروثی خواہ فطری
عادت ہے جس میں تبدیلی نہیں آسکتی، پھر یہ کہنا کہاں تک صحیح ہے کہ مستشرقین کے
مطالعات و تحقیقات میں اب تبدیلی آگئی ہے،

مستشرقین کے اصلی مخاطب

ہمارے اندازے کے مطابق مستشرقین کی اس ساری کدو کاوش
اور بحث و تحقیق کا منشا یہ ہے کہ وہ اہل مغرب اور مغربی تعلیم یافتہ طبقہ کے بارے میں
ہر وقت اس اندیشہ و تشویش میں مبتلا رہتے ہیں کہ اسلام کی اثر پذیری کی وجہ سے
یہ لوگ اس کے حلقہ بگوش ہو جائیں گے اس لیے مستشرقین اسلام کے اثر و رسوخ
کو ختم کرنے کے لیے اسے مسخ شدہ اور بدنما شکل میں پیش کرتے ہیں، تاکہ مغربی تعلیم یافتہ
طبقہ کے دل و دماغ میں اسلام کے متعلق بے اطمینانی اور الجھاؤ کی کیفیت باقی رہے۔
یورپ کے صلیب پرستوں اور مستشرقین کو یہ خطرہ برابر لاحق رہتا ہے کہ اسلام
کی جگمگاتی روشنی یورپ کے مسیحیوں کے تاریک دلوں کو روشن کردے گی جس طرح
وہ اس سے پہلے مصر، شام، شمالی افریقہ اور اندلس کے ظلمت پسندوں کے دلوں کو
روشن کر چکی ہے، ان تمام ملکوں کے مسیحیوں نے خوشی خوشی اپنی مرضی سے اسلام
قبول کیا، قرآن مجید کی زبان اپنائی اور اس کے علم کو بلند رکھنے کے لیے اس کے
دشمنوں سے جہاد کیا۔

یورپ کے مسیحیوں کی طرح کلیسا کے احبار و رہبان کو بھی ہر وقت اس کا
کھٹکا لگا ہوا ہے کہ اسلام کا نور مبین ظلمت کدۂ یورپ میں نہ پہنچ جائے اور کلیسا
کی تاریکیوں کو روشنی میں تبدیل کرکے اس کی حکمرانی کو پاش پاش نہ کردے۔
جس کے نتیجہ میں اصحاب کلیسا کی فتوحات و غنائم کے سارے دروازے بند ہو جائیں"

اسی غرض سے مستشرقین نے جو کلیسا کی بولتی ہوئی زبان ہیں اس طرح کی بحث و تحقیق کو اپنا شعار بنا لیا ہے تاکہ لوگوں کی آنکھوں پر ایسی پٹی باندھ دیں جس کے بعد اسلام کی صحیح شکل و صورت ہی ان کو نظر نہ آئے۔

اس مقصد کے حصول کے لیے انھوں نے اپنی تحریروں کے ابتدائی مرحلہ میں اسلام پیغمبر اسلام (صلی اللہ علیہ وسلم) اور مسلمانوں کے نظام زندگی و معاشرہ کے بارے میں دروغ گوئی و افترا پردازی سے کام لیا اور سب و شتم کی زبان اختیار کی لیکن بعد میں حالات کا رخ دیکھ کر اپنا انداز و اسلوب بدل دیا، شروع میں ان کی تحریروں اور تحقیقات کا انداز سادہ اور سپاٹ ہوتا تھا، لیکن بعد میں انھوں نے ان کو بڑے سلیقہ سے مرتب و مبوب کر کے تحقیق و استدلال کے رنگ و روغن سے انہیں مزین کر کے پیش کیا، ان میں گہرائی و گیرائی پیدا کی اور ان پر تحقیق و معروضیت کا لبادہ اوڑھا دیا، لیکن اس طرح کی ملمع کاری وغیرہ کے باوجود انھوں نے اپنے اغراض و مقاصد کو اوجھل نہیں ہونے دیا۔ ہمیشہ اپنی اس خصوصیت کو باقی رکھا کہ اسلام کے اثر و رسوخ سے یورپ پوری طرح محفوظ رہے۔

اس ظاہری تبدیلی کو دیکھ کر مسلمانوں کو یہ خیال ہونے لگا کہ اب مستشرقین نے گالی گلوج اور سب و شتم ترک کر دیا ہے، ان میں خوشگوار تبدیلی آگئی ہے، ان کی نیت نیک اور مقصد اچھا ہوتا ہے، ان کے دل اسلام اور مسلمانوں کی پرانی دشمنی و عداوت سے پاک ہو گئے ہیں، اب وہ انصاف و اعتدال کی راہ پر گامزن ہو گئے ہیں اور انھوں نے علمیت و معروضیت کو اپنا لیا ہے، حالانکہ صرف ان کا

انداز و آہنگ بدلا ہے نہ ان میں علمیت آئی ہے نہ معروضیت اور نہ انھوں نے اعتدال کی روش اختیار کی ہے، اسلوب بیان کی یہ تبدیلی محض حالات و تجربات کی بنیاد پر اختیار کی گئی ہے جو خود یورپی مسیحیوں کے ترقی یافتہ ذہن و دماغ کو مطمئن کرنے کے لیے ضروری تھی کیونکہ ان کی تحریروں کے اصل مخاطب وہی ہیں۔

جب ناواقفیت و جہالت کا زمانہ تھا اور لوگ سیدھے سادے تھے تو برا بھلا کہنے سے کام چل سکتا تھا اس لیے مستشرقین نے اپنے ابتدائی مراحل میں ایسا ہی کیا اور اسلام اور پیغمبر اسلام کو سب و شتم کا نشانہ بنایا، لیکن موجودہ زمانہ علم و معرفت اور روشن خیالی کا ہے، اب اسلام، پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کے متعلق یورپ والوں کی معلومات میں بڑا اضافہ ہو گیا ہے اس لیے ان ترقی یافتہ لوگوں کے ذہن و دماغ کو مطمئن کرنے کے لیے انداز تحقیق و اسلوب تحریر کو بدلنا ناگزیر ہو گیا تھا اس لیے مستشرقین اس کے لیے مجبور ہو گئے، موجودہ دور کے ایک مشہور مستشرق مسٹر مانٹگمری واٹ کا بیان ہے:

"دنیا کے عظیم لوگوں میں سب سے زیادہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو تنقید و ملامت کا ہدف بنایا گیا ہے، اس کی وجہ کو سمجھنا بہت دشوار و مشکل ہے[1]، اصل بات یہ ہے کہ صدیوں تک اسلام مسیحیت کا سب سے بڑا حریف و دشمن رہا ہے[2]"

---

[1] موصوف اگر "دشوار و مشکل" کی جگہ "آسان" کہتے تو حقیقت سے زیادہ قریب بات ہوتی،

[2] اسلام کبھی بھی مسیحیت کا دشمن نہیں رہا، اگر وہ دشمن ہے تو صرف صلیبیت اور اس کے انتقامی جذبہ کا جس کی آگ ابھی تک اسلام کی رواداری اور مسامحت کے باوجود صلیبیوں کے دلوں میں بھڑک رہی ہے،

لیکن مسیحیت کو کبھی بھی اسلام کی قوت وطاقت کا مقابلہ کرنے کا براہ راست یارا نہ ہوا، مصروشام اور ایشیائے کوچک کے بہت سے علاقے اس کے ہاتھوں سے نکل جانے کے بعد بیزنطینی امپائر پر حملہ کیا گیا اور ہسپانیہ و صقلیہ اور مغربی یورپ پر بھی خطرات کے بادل منڈلانے لگے"

اس جھوٹے پروپگنڈہ کی وجہ سے قرون وسطیٰ اور اس کے بعد کے زمانہ میں مغربی دل ودماغ کے اندر اسلام کی عداوت ونفرت پوری طرح مستحکم ہوگئی گو اس پروپگنڈہ کی کوئی حقیقت نہیں تھی تاہم یہ اپنا کام کرتا رہا،

اسی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو "امیر الظلمات" کہا گیا، جب گیارہویں صدی کا زمانہ آیا تو اسلام اور مسلمانوں کے متعلق صلیبیوں کے دماغ میں جو باطل اور خرافات پر مبنی افکار وتصورات بس گئے تھے انھوں نے برگ وبار لانا اور اپنا رنگ دکھانا شروع کر دیا جس کے نہایت عجیب وغریب اور افسوس ناک اثرات ظاہر ہوئے۔

صلیبیوں کو متنبہ کیا گیا تھا کہ وہ دشمنوں سے بدترین معاملہ کے لیے تیار رہیں، لیکن جب انھوں نے دشمنوں کو عموماً شجاع، جوانمرد اور دلیر پایا تو مسیحی اپنی دینی قیادت کی طرف سے شک وشبہ میں پڑ گئے، اسی شک کو دور کرنے کے لیے مسیحی پادری پطرس کو محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اور ان کے دین کے بارے میں زیادہ صحیح معلومات فراہم کرنا پڑا اور زبان وبیان کے انداز کو بدلنا پڑا، گذشتہ دو صدیوں میں اس سلسلہ میں نمایاں تبدیلی آئی ہے، اگرچہ اب بھی ان کے ذہن ودماغ اوہام وخرافات سے پر ہیں[1]۔ اس تبدیلی کے اسباب خود

---

[1] ماؤنٹگمری واٹ: محمد ان مدینہ ۱۹۳-۱۹۴۔

مستشرق موصوف کی زبانی سنئے، وہ کہتا ہے:

" صلیبیوں کو جب اپنے دشمنوں (مسلمانوں) میں اکثر لوگ بہادر وجانباز نظر آئے تو ان کے دلوں میں مسیحی دینی قیادت کی طرف سے شبہات پیدا ہونے لگے کیونکہ یورپی مسیحیوں نے صلیبی جنگوں کے دوران میں مسلمانوں کی وہ تصویر دیکھی جو ان کے پادریوں کی دکھائی ہوئی تصویر سے یکسر مختلف تھی، اس صورتحال کو دیکھنے کے بعد پادری پطرس کو محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اور ان کے لائے ہوئے دین کے متعلق زیادہ صحیح معلومات بہم پہونچانے کی ضرورت پڑی تاکہ یہ شک وشبہ زیادہ سنگین صورت اختیار نہ کر سکے"۔

ان سب کے بعد بھی کیا مستشرقین کی بحث وتحقیق کو معروضی اور غیر جانبدارانہ یا انہیں نیک نیت اور مخلص قرار دیا جا سکتا ہے۔

مستشرقین ہمارے لیے نہیں لکھتے

اوپر واضح کیا جا چکا ہے کہ استشراق کا اصل رخ اہل یورپ کی جانب ہے، مستشرقین کبھی اس خوش فہمی میں نہیں مبتلا ہوئے کہ ان کی بحث وتحقیق سے مسلمانوں کو فائدہ پہنچے گا یا وہ حوالہ ومرجع کا کام دیں گی۔

دنیا کی طویل تاریخ میں ایسا کہیں نظر نہیں آتا کہ کسی قوم وملت کے علم وفن، تہذیب وتاریخ، تمدن ومعاشرت اور دین وشریعت کے معاملہ میں غیر قوموں کے لوگوں کو مستند ومرجع بنایا گیا ہو، کسی غیر انگریز یا غیر جرمن شخص کو چاہے وہ علم وادب کی کتنی ہی بلندی پر کیوں نہ فائز ہو، انگریزی زبان وادب اور انگریزوں کی تہذیب وتاریخ اور ان کے معاشرتی ودینی مسائل کے بارے میں حجت سمجھا گیا ہو۔

لیکن دنیا کا یہ عجیب و غریب واقعہ مسلمانوں کے ساتھ ہو رہا ہے اور خود مسلمان بھی اپنے مسائل و معاملات کے سلسلہ میں مستشرقین کو حجت و معتبر بتانے لگے ہیں[۱] چنانچہ علم و اسلام کے ایک مرکزی ادارہ "جامع ازہر" کے کلیہ شریعت کے ایک لائق استاد اپنے درس کا آغاز اس طرح کرتے ہیں۔

"آج ہم "تاریخ التشریع الاسلامی" کے موضوع پر خالص علمی انداز کا ایسا درس دیں گے جس طرح کا درس جامع ازہر میں اس سے پہلے کبھی نہیں دیا گیا، مجھے یہ اعتراف کرنے میں کسی قسم کا کوئی تردد نہیں ہے کہ میں نے جامع ازہر میں تقریباً چودہ سال تعلیم پائی، لیکن اس لمبی مدت میں اسلام کو سمجھ نہیں سکا میں نے صحیح معنی میں اسلام کو جرمنی میں پڑھنے کے زمانہ میں سمجھا"[۲] فاضل موصوف نے جب حدیث و سنت کی تاریخ پر درس دینا شروع کیا تو اپنے سامنے میز پر رکھی ہوئی ایک ضخیم کتاب کا حرف بحرف ترجمہ پیش کرنا شروع کر دیا، جو گولڈزیہر کی لکھی ہوئی "دراسات اسلامیہ" تھی موصوف اس کی عبارتیں پڑھ کر کہتے جاتے تھے کہ "یہ خالص علمی حقایق ہیں"

دنیا کی دوسری قوموں میں جو بات ناممکن تھی وہ ہمارے یہاں ممکن ہی نہیں واقعہ بنی ہوئی ہے، ہمارے اندر یونانی ادب، لاطینی ادب، فرانسیسی ادب اور انگریزی ادب کے بڑے بڑے ماہرین پیدا ہوئے، لیکن اگر یہ حضرات ان زبانوں

[۱] محمود محمد شاکر "المتنبی" [۲] شیخ علی حسن عبد القادر کا واقعہ ہے، مگر انھوں نے اب مستشرقین کے سلسلہ میں اپنی اس رائے سے رجوع کر لیا ہے، جس کی تفصیل انکی کتاب "نظرۃ عامۃ فی تاریخ الفقہ الاسلامی" میں دیکھی جا سکتی ہے،

اور ان قوموں کے عقائد اور تاریخ و معاشرت کے بارے میں کچھ لکھیں تو اسے کبھی بھی مستند مرجع و مصدر کی حیثیت حاصل نہیں ہوگی، اس طرح اگر ہمارے عربی قوم[۱] اور عربی ادب کے استاد کل[۲] یونانی تاریخ یا فرانسیسی ادبیات پر کچھ خامہ فرسائی کریں تو وہاں کے لوگ کبھی بھی انہیں اپنے مراجع و مصادر کی فہرست میں جگہ نہیں دیں گے اور نہ وہ ان پر اس طرح کا اعتماد کریں گے جس طرح کا اعتماد وہ اپنے علماء و محققین پر کرتے ہیں۔

یہ دراصل مسلمانوں کی پستی و انحطاط کا نتیجہ ہے کہ تہی مایہ مستشرقین ہمارے علم و ادب اور مذہب و تمدن کے بارے میں جو کچھ الٹا سیدھا لکھ دیتے ہیں وہ اسے سرآنکھوں پر جگہ دیتے ہیں اور انہیں اپنے اداروں اور اکیڈمیوں کا ممبر بنانے میں فخر محسوس کرتے ہیں[۳]

ایک دفعہ تیمور پاشا نے علامہ محمود شاکر کو رسالہ "الجمعیۃ الملکیۃ الآسیویۃ" کے جون ۱۹۲۵ء کا شمارہ اس غرض سے دیا کہ وہ اس میں مارگولیتھ کے مقالہ کو پڑھ کر اس کے متعلق اپنے تاثرات سے انہیں آگاہ فرمائیں، شاکر صاحب اس وقت یونیورسٹی کے ایک نوجوان طالب علم تھے۔ انھوں نے بتایا کہ مقالہ نگار بے حس و تہی دست عجمی ہے اس نے اپنی عادت کے مطابق اس مقالہ میں بڑی بے حیائی سے کام لیا ہے، یہ سن کر تیمور پاشا مسکرائے اور خوشی کا اظہار کیا، شاکر صاحب نے مزید کہا کہ "یہ عجمی جتنی عربی جانتا ہے اس سے کہیں زیادہ میں انگریزی سے

[۱] احمد لطفی السید [۲] ڈاکٹر طہٰ حسین [۳] یہ الفاظ استاد محمود شاکر صاحب نے اس وقت کہے تھے جب ان سے احمد تیمور پاشا نے "مارگولیتھ" کے بارے میں سوال کیا تھا۔

واقف ہوں، بلکہ وہ آخری عمر اور مرتے دم تک جتنی عربی سیکھ سکتا ہے، اس سے کئی گنا زیادہ میں انگریزی شعر و ادب سے واقف ہوں اور انگریزی شعر و ادب کے نشو و نما سے لے کر اب تک کے تمام ادبی مجموعوں کو نقد و جرح کا نشانہ بنا سکتا ہوں۔ لیکن میں دوسروں کے زبان و ادب سے کھیلنا پسند نہیں کرتا، یہ گردشِ روزگار کا کیسا عبرتناک واقعہ ہے کہ آج ہمارے شعر و ادب پر ایک تہی دست عجمی اس طرح رائے زنی کر رہا ہے۔

استشراق و مستشرقین کے سلسلہ میں ہماری سب سے بڑی مصیبت یہی الٹی صورت حال ہے کہ مسلمان ان تحقیقات پر اعتماد کرنے لگے ہیں جو انکے بجائے اصلاً مغربی تعلیم یافتہ لوگوں کے لیے لکھی گئی تھیں، اس سے بھی زیادہ سنگین مسئلہ اور عجیب و غریب صورتحال یہ ہے کہ آج ہم انھی کو اپنا قابل اعتماد استاد و معلم مانتے ہیں، ان کے آگے زانوئے تلمذ تہ کرتے ہیں، اپنی تاریخ اور اپنی زبان و ادب کا درس لیتے ہیں اور اپنے معاشرتی مسائل میں ان سے رہنمائی حاصل کرتے ہیں، اس عجیب و غریب صورت حال کی کتنی اچھی تصویر کشی مولانا سید ابو الاعلیٰ مودودی مرحوم نے کی ہے فرماتے ہیں:

"ایک زمانہ تھا کہ یورپ کے مسیحی علمائے اسلام سے اپنی کتاب مقدس تورات و انجیل کا درس لینے کے لیے اندلس کا قصد کرتے تھے، لیکن اب معاملہ سرے سے الٹ گیا ہے، یعنی خود مسلمان علمائے مغرب سے اسلام اور تاریخ اسلام کا درس لینے کے لیے یورپ و امریکہ کا سفر کرتے ہیں، ان سے عربی زبان و ادب سیکھتے ہیں، تاریخِ اسلام پر لکھ دینے کے لیے انہیں مدعو کرتے ہیں اور

اسلام اور مسلمانوں کے متعلق مستشرقین کے فرمائے ہوئے کو مستند سمجھ کر اپنے کالجوں اور یونیورسٹیوں کے نصاب میں داخل کرتے ہیں، جبکہ اہل مغرب اپنے سوا کسی قوم کے علماء و فضلا کو اپنے مذہب اپنی تاریخ اور اپنے علوم و فنون پر رائے زنی کی اجازت نہیں دیتے ہیں اور نہ ان کو کسی معمولی و غیر معمولی معاملہ میں مستند مانتے ہیں۔"[1]

---

[1] الاستاذ السید ابو الاعلیٰ مودودی: الاسلام فی مواجهة التحدیات المعاصرة، ص ۲۷۱۔

فتح نامۂ محمود شاہی پر ایک تحقیقی نظر

از ڈاکٹر نورالسعید اختر (۱)

دکن اپنے درخشاں تمدن کے لیے نہ صرف ہندوستان میں بلکہ بیرونی ممالک میں بھی معروف ہے۔ یہ خطہ اپنی قدیم روایات اور اقدار کے لیے بھی مشہور ہے۔ ۷۴۸ھ مطابق ۱۳۴۷ء میں اس پرشکوہ علاقہ پر ایک نئی سلطنت کی بنیاد ڈالی گئی جو تاریخ ہند میں بہمنی سلطنت کے نام سے مشہور ہے لیکن صرف ڈیڑھ سو سال کے اندر اندر یہ مستحکم اور اقبال مند سلطنت زوال پذیر ہوگئی، دکنیوں، نوواردترکوں اور ایرانیوں کی رنجش نے باہمی رقابت کو ہوا دی۔ جس کے نتیجہ میں خواجہ محمود گاوان اور خلف حسن بصری کو موت کے گھاٹ اتار دیا گیا اور دیکھتے ہی دیکھتے سلطنت بہمنیہ کا شیرازہ بکھر گیا، بہمنی بادشاہ محمد شاہ لشکری کے انتقال کے بعد جب اس کا کمسن بیٹا محمود شاہ بہمنی ۱۴۸۲ء میں جانشین ہوا تو بدامنی اور انتشار نے ہر طرف سر اٹھایا بلکہ بقول ڈاکٹر عبدالمجید صدیقی:

"چنانچہ ۸۹۶ھ/۱۴۹۰ء میں جس کو سلطنت بہمنی کی آخری تاریخ سمجھنا چاہیے، تمام صوبہ دار جو مختلف صوبوں پر قابض تھے، خودمختار ہوگئے اور اس طریقے سے نظام شاہی، عادل شاہی اور عماد شاہی

(۱) شعبۂ فارسی مہاراشٹر کالج بمبئی۔

سلطنتیں قائم ہوگئیں"۔ [۱]

۸۹۶ھ/۱۴۹۰ء میں اہل بیدر نے محمود شاہ بہمنی پر اچانک دھاوا بول دیا تھا اور بادشاہ کی جان خطرے میں پڑ گئی تھی۔ ایسے نازک موقع پر حسن علی سبزواری، سید مرزائی مشہدی اور سلطان قلی نے اپنی جان پر کھیل کر بادشاہ کی حفاظت کی تھی۔ اس شجاعت اور بہادری کے عوض محمود شاہ بہمنی نے سلطان قلی کو "قطب الملک" کے لقب سے سرفراز کیا تھا۔

سلطان محمود شاہ بہمنی کا یہ آشوب دور خودمختاری اور بغاوتوں سے بھرا ہوا ہے۔ ۸۹۸ھ/۱۴۹۲ء میں گلبرگہ کے گورنر دستور دینار حبشی [۲] نے بادشاہ وقت کے خلاف علم بغاوت بلند کیا اور اس کے ایک سال بعد مغربی ساحل (گوا کا علاقہ) پر بہمنی امیر بہادر گیلانی نے بغاوت کا پرچم لہرایا، بادشاہ اپنے آزمودہ کار امیروں کے ساتھ ان بغاوتوں کو کچلنے کے لیے پہنچا۔ سلطان قلی جسے قطب الملک کے خطاب سے نوازا گیا تھا اس جنگ میں شریک تھا جنگ سے چند دنوں قبل اس کو تلنگانے کا صوبہ دار بنایا گیا تھا۔

دکن میں بہمنی خاندان نے تقریباً ڈیڑھ سو سال حکمرانی کی۔ یہ ایک شاندار تاریخی دور تھا۔ اس زمانے میں علم وادب اور تہذیب وتمدن کو جو فروغ حاصل ہوا اس کی عظیم الشان روایات بہمنی سلطنت کی جانشین سلطنتوں کو ورثہ

[۱] تاریخ گولکنڈہ از عبدالمجید صدیقی: ص ۹
[۲] دستور دینار حبشی گلبرگہ کا گورنر تھا محمود شاہ بہمنی (سوم) کے عہد میں اس نے مرکزی حکومت کے خلاف بغاوت کی تھی۔ تاریخ گولکنڈہ از عبدالمجید صدیقی ص ۲۹۔

میں ملی تھیں۔ بہمنی حکمرانوں کی شان و شوکت، داد و دہش اور فضل و کمال کی قدر دانی
کا شہرہ دور دور تک پہنچ چکا تھا، ایران و توران کے دانشور و ادیب ہندوستان
کا رخ کر رہے تھے۔ حتیٰ کہ محمود شاہ بہمنی کی فیاضی اور علم دوستی نے پیغمبر سخن
حافظ شیرازی[1] کو بھی دکن کے سفر کی طرف مائل کر دیا تھا۔ علاوہ ازیں بہمنی وزیر
مملکت خواجہ محمود گاواں کے عبدالرحمٰن جامی سے خصوصی تعلقات تھے۔ لہٰذا بہمنی
بادشاہوں کی سرپرستی اور علم دوستی سے جنوبی ہند میں فارسی زبان و ادب کا
گلستان مدتوں سر سبز و شاداب رہا۔

فیروز شاہ بہمنی کا انتقال ۸۲۵ھ/۱۴۲۲ء میں ہوا۔ عراق کے سوداگر
اور مدبر خواجہ حسن بصری کی وساطت سے احمد خاں، خان خانان، احمد شاہ ولی
بہمنی کے لقب سے تخت نشین ہوا۔ وہ صوفی منش بادشاہ تھا اور اسے ایران
کے صوفی بزرگ شاہ نعمت اللہ ولی سید کرمانی سے بے پناہ عقیدت تھی۔ اسکے
عہد میں احسن آباد (گلبرگہ) کی بجائے محمد آباد (بیدر) کو پایۂ تخت کا درجہ دیا
گیا۔ احمد شاہ ولی بہمنی کے عہد میں دو حبشی غلاموں کو عین الملک[2] اور نظام الملک[3]
کے القاب سے نوازا گیا۔

ہمایوں شاہ بہمنی نہایت سفاک اور ظالم بادشاہ گذرا ہے وہ شاہ محب اللہ

[1] فرشتہ کی روایت کے بموجب حافظ شیرازی نے ہندوستان کے ترک سفر کے ساتھ میر فیض اللہ
انجو کی معرفت ایک غزل محمد شاہ بہمنی کو بھیجی تھی جس کا مطلع یہ ہے

دمے باغم بسر بردن جہان یکسر نمی ارزد   بمے بفروش دلق ما کزیں بہتر نمی ارزد (دیوان حافظ)

[2] ہوشیار نامی حبشی کو عین الملک کا خطاب دیا گیا [3] "بیدار" نامی حبشی کو نظام الملک کا خطاب دیا گیا۔

(شاہ نعمت اللہ ولی کے پوتے) اور خواجہ عماد الدین گیلانی کے توسط سے تخت نشین
ہوا تھا، شاہ حبیب اللہ ہمایوں شاہ کے چھوٹے بھائی حسن خاں کو بادشاہ بنانا
چاہتے تھے۔ ہمایوں شاہ کو اس بات کا پتہ چل گیا۔ حسن خاں اور شاہ حبیب اللہ
قید کر لیے گئے، کچھ دنوں بعد ان لوگوں نے راہِ فرار اختیار کی مگر بیجاپور میں
گرفتار کر لیے گئے اور بے دردی کے ساتھ قتل کر دیے گئے۔ ۸۶۵ھ/۱۴۶۱ء
میں ہمایوں شاہ اپنے کیفر کردار کو پہنچا۔ اس واقعہ کے بعد آفاقیوں (ترک
و ایرانی) اور دکنیوں میں خصومت کا سلسلہ دراز ہو گیا۔

مخدوم جہاں، خواجہ جہاں ترک اور محمود گاواں نے بہمنی سلطنت کو زوال
سے بچایا، محمود شاہ سوم (۸۶۷ھ تا ۸۸۷ھ) کے عہد میں محمود گاواں سیاہ و سفید
کا مالک رہا۔ محمود گاواں نے امن و امان قائم کیا۔ چنانچہ علم و ادب کے نور سے
بہمنی سلطنت دمک اٹھی۔ محمد جلال الدین دوانی اور شیخ ابراہیم ملتانی نے محمود گاواں
کی قائم کردہ یونیورسٹی کی سربراہی کی۔ نور الدین آذری[1] کے نامکمل "بہمن نامہ" کو ملا سماعی
نے پایۂ تکمیل کو پہنچایا۔ ہندوستان کا شہر بیدر دنیائے اسلام کا "بغداد" بن گیا۔
الغرض شہر بیدر اسلامی تہذیب و ثقافت کا مرکز بن گیا تھا اور یہاں پر بغداد
نیشاپور اور شیراز کی طرح علم و دانش کی آبیاری ہونے لگی تھی۔

بہمنی سلطنت کے آخری دور میں وزیر محمود گاواں نے دکن میں بزم علم و
دانش آراستہ کی۔ اس نے نہ صرف اپنا مشہور و معروف مدرسہ قائم کیا بلکہ علم کی

[1] احمد شاہ ولی بہمنی کے عہد میں شیخ نور الدین آذری کو "بہمن نامہ" لکھنے پر مامور کیا گیا تھا۔ شرف الدین
مازندرانی کتابت کے فرائض انجام دیتے تھے۔ از تاریخ فرشتہ۔

ہر شاخ کی سرپرستی کی اور اس کے نتیجہ میں ایرانی ادیب جوق در جوق دکن کا رخ کر رہے تھے۔ علماء و فضلاء کے اس قافلے میں "فتح نامہ محمود شاہی" کا مصنف نعمت اللہ عیانی بھی تھا

نعمت اللہ عیانی سے متعلق تذکرے خاموش ہیں۔ تاریخوں میں بھی اس کا کوئی ذکر نہیں ملتا ہے۔ عیانی کے کارناموں کی طرف راقم کی توجہ استاذی ڈاکٹر نذیر احمد (علی گڑھ) نے مبذول کی تھی۔ گذشتہ سال (سنہ ۱۹۹۰ء) کی سرما کی چھٹیوں میں مدراس جانے کا اتفاق ہوا اور مدراس یونیورسٹی میں واقع اورینٹل انسٹی ٹیوٹ کی کتابدار محترمہ زیب النساء صاحبہ کی وساطت سے عیانی کے کلیات اور فتح نامہ محمود شاہی کے زیراکس حاصل ہو سکے، اس سلسلے میں راقم کے دوست جناب انیس محسن (ساکن مدراس) نے بھی زحمت اٹھائی جس کا راقم تہہ دل سے مشکور ہے۔

فتح نامہ محمود شاہی کا تعارف

یہ مخطوطہ اورینٹل مینسکرپٹس لائبریری، مدراس یونیورسٹی مدراس کا مخزونہ ہے۔ پی، پی، سبرامنیم شاستری نے دی ڈسکرپٹیو کیٹلاگ آف دی پرشین مینسکرپٹس کے صفحہ نمبر ۲۳۴ پر فتح نامہ محمود شاہی نمبر ۲ ۹ (بی) کا تعارف ذیل کی تفصیلات کے ساتھ پیش کیا ہے۔[1]

(۱) کل صفحات ۵۴ (۲) فی صفحہ سطر: ۱۱ (۳) زبان فارسی (منظوم) (۴)

[1] The Descriptive catalogue of Islamic Manuscripts in the Govt oriental MSS library Madras by P.P.S. Sastri vol I PP232-234. Published 1939 A.D.

کیفیت: نہایت مخدوش (۵) حالت: قدیم (۶) موضوع: تاریخ (۷) مصنف: نعمت اللہ عیانی (۸) کاتب: نامعلوم (۹) سن کتابت: ندارد (۱۰) مختصر تعارف: گلبرگہ کے گورنر دستور دینار حبشی کی بغاوت (سنہ ۸۹۵ھ) اور اس کے انسداد کا مفصل حال ایک تاریخی دستاویز۔

نعمت اللہ عیانی کا تعارف

عیانی کے نجی حالات معلوم نہیں ہیں۔ بس اتنا معلوم ہے کہ اس کا پورا نام نعمت اللہ اور عیانی تخلص تھا۔[1] وہ دیگر ایرانی شعراء کی طرح ۴۵ سال کی عمر میں محمود شاہ بہمنی کی فیاضیوں کا چرچا سن کر ہندوستان آیا تھا۔ چنانچہ وہ اس حقیقت کی طرف ان الفاظ میں اشارہ کرتا ہے ؎

شہا بود چہل و پنج سال تا مسکین بعشق و یدنت از ملک خود بر آمدہ ام (کلیات ص ۵۵)

محمود شاہ بہمنی سنہ ۱۴۸۲ء میں تخت نشین ہوا۔ اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ عیانی محمود شاہ بہمنی کی تخت نشینی کے فوراً بعد ہندوستان آگیا تھا تو مندرجہ بالا شعر کی روشنی میں اس کی تاریخ پیدائش کا سال سنہ ۱۴۳۷ء بر آمد ہوتا ہے۔

عیانی، شاہ خلیل اللہ "بت شکن" فرزند شاہ نعمت اللہ ولی سید کے صاحبزادوں شاہ محب اللہ اور شاہ حبیب اللہ سے خاص عقیدت رکھتے تھے، ان کی مدح میں عیانی نے متعدد قصائد بھی کہے ہیں۔ عیانی کو دیگر اصناف سخن پر بھی دستگاہ حاصل تھی بقول عیانی ؎

[1] فرشتہ نے محمود شاہ بہمنی کے عہد میں ایک بارسوخ بزرگ خواجہ نعمت اللہ کا جگہ جگہ ذکر کیا ہے، راقم کا خیال ہے کہ خواجہ نعمت اللہ اور نعمت اللہ عیانی ایک ہی بزرگ کے دو نام ہیں۔ البتہ اس قیاس کے لیے کوئی تاریخی ثبوت نہیں ہے۔

قصیدہ و غزل و قطعہ و رباعی و فرد — ز مثنوی و ز ترجیع بند و آنچہ دارد نام (کلیات منقول ص۵۳)

کلیات عیانی کے آخر میں ایک مرثیہ بھی شامل ہے جو بحیثیت ایک صوفی کے خاندان نبوت سے ان کے خصوصی لگاؤ کی نشاندہی کرتا ہے۔ عیانی کو اپنی شاعری پر بھی ناز تھا۔ لہٰذا تعلی آمیز انداز میں عیانی کی گہر افشانی دیکھئے:۔

زبحر شعر بدرج سحاب است شما — من فقیر، تو انگر بگوہر آمدہ ام (کذا) (کلیات۔ ص۵۵)

عیانی گرچہ بے نام و نہ آنم — کہ بر در ہا برائے تکیہ کردم

شوم منعم چو نقد شعر خود را — بنام شاہ عالم سکہ کردم

عیانی نظم رنگین تو یکسر — سرہ نقدیست کان از کان جانست کذا

بنام و سکہ شاہ کریمان — بحمد اللہ کہ در عالم روانست

دل عیانی از اندیشہ گشتہ است دو نیم — یکی چہ باشد اگر خوانیش بلطف تمام

عہد بہمنیہ کی تاریخ پر آج تک کوئی ٹھوس کام نہیں ہوا ہے۔ فی الوقت ہم اتنا جانتے ہیں کہ نورالدین آذری، ملا داؤد بیدری اور سماعی اس عہد کے سر برآوردہ شاعروں میں سے تھے۔ عیانی نے عہد بہمنیہ کے آخری نام نہاد بادشاہ کی جنگی کارگذاریوں کی مختصر مگر منظوم تاریخ یادگار چھوڑی ہے۔ کلیات میں مدحیہ قصائد عیانی رجحان کی نمائندگی کرتے ہیں۔ عیانی نے اپنے پیر و مرشد شاہ نعمت اللہ ولی سید کے سلسلے کے لوگوں کی دل و جان سے تعریف کی ہے جس سے اس خاندان سے ان کی والہانہ عقیدتمندی کا اظہار ہوتا ہے مثال کے طور پر:۔

قطب زمانہ شاہ محب اللہ آنکہ او — از جود حساب گدا بادشاہ کند (کلیات ص۲۶)

ہمت شاہ محب باز بجاست و کن — کار خود چون نکند... قطب لاقطاب (کذا)

قطب زمانہ شاہ محب اللہ آنکہ ہست — شاہ فلک سریر ملک لشکر و سپاہ (کذا)

ترجیع:۔

حبیب الدین محب اللہ باشد — ہمیشہ تا جہاں را شاہ باشد (کذا)

عیانی کے علمی و ادبی کارنامے

نعمت اللہ عیانی کے دو کارنامے دستبرد زمانہ سے محفوظ ہیں۔ ان میں سے ایک اس کا دیوان ہے جو قصائد، ترجیع بند، غزلیات اور ایک مرثیہ پر مشتمل ہے۔ اس دیوان میں کم و بیش ۱۱۳۰۰ اشعار ہیں۔ عیانی کی شعری صلاحیتوں کو دیکھتے ہوئے یہ قیاس ہوتا ہے کہ ان کا یہ موجودہ دیوان ان کے کل کلام پر مشتمل نہیں ہے لیکن اس کا کوئی ثبوت پیش نہیں کیا جا سکتا۔ یہ مختصر دیوان، جیسا کہ ذکر کیا جا چکا ہے اورینٹل انسٹی ٹیوٹ لائبریری میں محفوظ ہے اور اس کی ایک نقل جو ۱۹۴۵ء میں تیار کی گئی تھی مدراس یونیورسٹی کے کتبخانے میں محفوظ ہے اس کے ناقل نے اس میں بہت غلطیاں کر دی ہیں۔ راقم بڑی حد تک ان غلطیوں کو درست کرنے میں کامیاب ہوا ہے۔ البتہ وہ اشعار جو آب زدہ اور کرم خوردہ ہیں درست نہ کیے جا سکے۔

عیانی کا دوسرا کارنامہ فتح نامہ محمود شاہی ہے۔ اس کا مخطوطہ بھی اورینٹل انسٹی ٹیوٹ لائبریری مدراس کی ملکیت ہے۔ یہ فتح نامہ جس جلد میں شیرازہ بند ہے اس کے ابتدائی حصے میں عبداللہ بن عبدالجبار کے حدیث سے متعلق ایک رسالہ موسوم بہ "زبدۃ الاخبار" نقل ہے۔ اس کے بعد فتح نامہ شروع ہوتا ہے۔ جس میں ۵۴ صفحات ہیں۔ ہر صفحہ گیارہ سطری ہے اور عنوانات سرخ سیاہی سے لکھے ہوئے ہیں۔ نسخہ کی بوسیدگی اس کی قدامت کی دلیل ہے اس میں کل ۵۰۸

اشعار ہیں۔ عیانی کا کلیات مندرجہ ذیل عنوانات پر مشتمل ہے۔

۱ در منقبت

۲ در تتبع بحر الابرار (امیر خسرو گوید)

۳ ولہ

۴ در تہنیتِ مولود

۵ ترجیع بند

۶ المقطعات

۷ غزلیات

۸ مرثیہ

فتح نامہ محمود شاہی کا خلاصہ

فتح نامہ محمود شاہی کی ابتدا احمد خداوندی سے ہوتی ہے۔ اس کے بعد نعتِ رسول اکرم ہے۔ بادشاہ وقت کی مدح کے بعد شاہ نعمت اللہ ولی سید کو خواب میں دیکھنے کا واقعہ ہے۔ عیانی نعمت اللہی سلسلے کے بزرگوں شاہ حبیب اللہ اور صوفیِ صافی شاہ محب اللہ کا بھی معتقد تھا۔ لہٰذا ان دونوں بزرگوں کی مدح بھی فتح نامہ میں موجود ہے۔ ان مدحیہ اشعار کے بعد فتح نامہ کا آغاز ہوتا ہے۔ اس نظم کے مطابق محمود شاہ بہمنی کو گلبرگہ کے گورنر دستور دینار حبشی کی بغاوت کی اطلاع ملتی ہے اور وہ اس کی سرکوبی کے لیے اپنے آزمودہ سپاہیوں اور جری امیروں اور سپہ سالاروں کے ساتھ بنفسِ نفیس میدان جنگ کا رخ کرتا ہے۔ عیانی کے فتح نامہ میں عہد بہمنیہ کے آخری دور کے تمام سورماؤں کا فرداً فرداً ذکر کیا گیا ہے۔ ان میں چند ایسے نام بھی ہیں جن کے

بارے میں عہد بہمنیہ کی تاریخیں خاموش ہیں۔ عیانی نے مختصراً مگر جامع انداز میں ان کا تعارف پیش کیا ہے اور ان کے کارناموں کو خوبصورت شعری پیکر میں ڈھال دیا ہے۔ دراصل عیانی کا بڑا احسان یہ ہے کہ اس نے تاریخی واقعات کو محفوظ کر دیا ہے ورنہ قلعہ "ساغر" نزد گلبرگہ کی فتح تاریخ کے صفحوں سے اوجھل رہتی۔ فتح نامہ کے آخر میں عیانی نے "در تعریف سخن و نام نامہ" کے عنوان سے اپنے کارنامہ کی ادبی اور شعری خصوصیات پر روشنی ڈالی ہے اور شعر و سخن سے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ فتح نامہ کا اختتام دعائیہ اشعار پر ہوتا ہے۔

فتح نامہ محمود شاہی پر تنقیدی نظر

نعمت اللہ عیانی کا فتح نامہ ایک عینی شہادت نامہ اور کارآمد تاریخی دستاویز ہے۔ یہ فتح نامہ آج سے ٹھیک پانچسو (۵۰۰) سال قبل رونما ہونے والے واقعہ کی منظوم تصویر ہمارے سامنے پیش کرتا ہے۔ اس کی ادبی، سیاسی اور تاریخی اعتبار سے کافی اہمیت ہے۔ عیانی نے نہایت صاف ستھرے اور بلا تکلف انداز میں تاریخی حقائق کی عکاسی کی ہے۔ عیانی کے یہاں الفاظ کا برجستہ استعمال ہے۔ صنائع و بدائع کو برمحل برتا گیا ہے۔ زبان نہایت سلیس، رواں اور عام فہم ہے۔ دور از کار تشبیہات اور استعاروں سے پرہیز کیا گیا ہے۔ ان مجموعی خصوصیات نے "فتح نامہ" کو ایک ادب پارہ کی حیثیت دے دی ہے۔

"فتح نامہ" کے اشعار اس امر کی غمازی کرتے ہیں کہ عیانی نے نورالدین آذری کے "بہمن نامہ" سے استفادہ کیا ہوگا اور اس لحاظ سے عیانی کے "فتح نامہ" کو آذری کے "بہمن نامہ" کا تتمہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ آذری کے بعد عیانی نے پانچویں بہمنی بادشاہ کی مہم جوئی کا اضافہ کر دیا ہے۔ افسوس ہے کہ اس کے بعد سارے بہمنی بادشاہ

قلعہ کی چہار دیواری میں محصور رہے۔ بہرکیف فتح نامہ محمود شاہی دور کا بے داغ آئینہ ہے جس میں ڈوبتے ہوئے بہمنی سلطنت کے سورج کی آخری پرحشمت شعاعیں اور عظیم لمحات کا عکس دیکھا جاسکتا ہے۔

فتح نامہ محمود شاہی کی ابتدا حمد خداوندی سے ہوتی ہے ؎

بہ انا فتحنا کنم ابتدا — کہ ما گمرہان را بود رہنما

اس کے بعد نعت رسول اکرم ہے ؎

محمد علیہ الصلوٰۃ السلام — کہ ایزد بہ او داد دین کلام (کذا)

نعت رسول کے بعد بادشاہ وقت محمود شاہ بہمنی ۱۴۸۲ء تا ۱۵۱۸ء کی تعریف و توصیف میں یہ اشعار ہیں

شہنشاہ جم جاہ محمود شاہ — شبہ انجمن چرخ انجم سپاہ

عدو تا کند جامہ بر تن قبا — بزن دست در دامن او لیا

بہمنی بادشاہ احمد شاہ ولی کو شاہ نعمت اللہ ولی سید کرمانی[1] (ایران) سے والہانہ عقیدت تھی۔ محمود شاہ بہمنی بھی ان کا معتقد رہا۔ عیانی کو بھی شاہ نعمت اللہ اور اس سلسلے کے تمام بزرگوں سے روحانی لگاؤ تھا۔ لہٰذا عیانی بادشاہ وقت کی مدح سرائی کے بعد شاہان بہمنیہ کے پیر و مرشد شاہ نعمت اللہ ولی سید کے خواب میں حاضر ہونے کا ذکر کرتا ہے یہ دکنی شعراء کا عام شیوہ رہا ہے۔ قطبی گولکنڈوی نے ملک الشعراء وجہی کے خواب میں آنے اور اس کی مثنوی کی تعریف

[1] احمد شاہ ولی بہمنی نے شاہ نعمت اللہ ولی سید کرمانی (ایران) کا مقبرہ بھی تعمیر کروایا تھا (دیوان شاہ نعمت اللہ ص)

کرنے کا ذکر نہایت دلکش انداز میں کیا ہے) عیانی کی زبانی پیر و مرشد کا ذکر سنیئے:

شبے دید در خواب اہل دلے — سعیدے مبارک سپے مقبلے

خدایا مددگار این شاہ باد — مدد شاہ دین نعمت اللہ باد

نعمت اللہی سلسلے کے بزرگ میرزا حبیب اللہ[1] بہمنی بادشاہوں کی عقیدتمندی سے متاثر ہوکر ہندوستان چلے آئے تھے۔ ان بزرگوں نے سیاست میں بھی دخل دینا شروع کر دیا تھا۔ لہٰذا انہیں شاہی عذاب اور قید و بند سے دوچار ہونا پڑا تھا عیانی شاہ نعمت اللہ کے بعد میرزا حبیب اللہ ابن محب اللہ طول عمرہ کا ذکر نہایت مودبانہ انداز میں کرتے ہیں۔ انکے اعتقاد کی جھلکیاں ملاحظہ کیجئے:-

دہن را بشویم بمشک و گلاب — کنم مدح مخدوم عالی جناب

محب امت و مخلص شہنشاہ را — بود جانشین نعمت اللہ را

اصل قصہ اس کے بعد شروع ہوتا ہے جسے "آغاز داستان" کا عنوان دیا گیا ہے ؎

بیا داستانے ز نو گوش کن — ز دستان رستم فراموش کن[2]

مندرجہ بالا عنوان کے تحت عیانی نے محمود شاہ بہمنی ۱۴۸۲ء/۱۵۱۸ء کے عہد میں ہونے والے فتنہ و فساد اور بغاوتوں کی تاریخ و سال کی طرف اشارہ کیا ہے اس نے بادشاہ وقت کی شان و شوکت کی طرف بھی توجہ مبذول کی ہے اور یہ کھلے الفاظ میں کہا ہے کہ ۸۶۰ھ میں چاروں طرف بغاوتوں کا بازار گرم ہوگیا تھا۔ بادشاہ امیروں اور صوبے داروں کے ہاتھ کٹھ پتلی بنا ہوا تھا، بادشاہ کے

[1] شاہ نعمت ولی نے اپنے پوتے شاہ نوراللہ کو ہندوستان روانہ کیا تھا، وہ اپنے بیٹے شاہ خلیل اللہ کی جدائی گوارا نہیں کر سکتے تھے۔ (دیوان شاہ نعمت اللہ ص [2] دستان رستم، مراد ہے شاہنامہ از فردوسی

نمکخوار، نمک حرام بنتے جا رہے تھے ؎

بجاہ و جلالش دگر نیست شاہ　　بحسن و جمال آفتابست و ماہ

بود سال آن ماہ دو پنج و چار　　دو الیست یارب کہ بادا ہزار [کذا]

فرس بر مدو مہر بر می کند　　بہر مہ مہے دگر می کند "

بتاریخ نو صد دو کم در شمار　　چپ و راست صد فتنہ گشت آشکار "

(۸۹۸ھ/۱۴۹۲ء)

بملک دکن قصۂ رو نمود　　کہ جز قصد جان غریبان بود

عیانی نے اس کے بعد جو عنوان قائم کیا ہے، اس میں کہا گیا ہے کہ: حاکم وقت کو کبھی غافل نہیں رہنا چاہیے۔ حکومت میں پیش آنے والی اور رعایا پر گذرنے والی ہر چھوٹی بڑی آفت سے اسے باخبر رہنا چاہیے۔ کیونکہ معمولی چنگاری بھی شعلہ بن سکتی ہے۔

عیانی کا قول ہے کہ بادشاہ اپنی رعایا کا معالج ہوتا ہے اسے اپنی بیمار اور کمزور رعایا کا خیال رکھنا چاہیے۔ چنانچہ بہ الفاظِ عیانی ؎

خبر بر خبر وین چنیں باز گشت　　کہ از شاہ چیزے نشاید نہفت

رعیت مریضند و شاہان طبیب　　بدست طبیبان دوائے غریب

شود سرخ روہائے زرد از طبیب　　نشاید نہان داشت درد از طبیب

شاہی خیر خواہوں نے انہی باتوں کے پیشِ نظر بادشاہ سلامت کو گلبرگہ کے گورنر دستور دینار حبشی کی سرکشی سے آگاہ کیا۔ اس باغی کے پاس بے شمار خزانہ اکٹھا ہو گیا تھا۔ لہٰذا اس نمک حرام نے اچھی خاصی فوج جمع کر لی تھی۔ رعایا اس کی

زیادتیوں سے پریشان تھی۔ لہٰذا حاکم وقت کے لیے اس کی سرکوبی ضروری ہو گئی تھی۔ چنانچہ عیانی ان ناگفتہ بہ حالات کی عکاسی مندرجۂ ذیل الفاظ میں کرتے ہیں :-

حبوشش اتفاقے عجب کردہ اند　　بخود روزِ روشن چو شب کردہ اند

ازین جملہ دستور دینار نام　　کہ دارد زر و مال و لشکر تمام

بجمعی پریشان ہم جنس خویش　　یکی گشتہ و گشتہ از دین خویش

ز طوق غلامی دگر گشتہ اند　　ز شاہ ملک جاہ برگشتہ اند

نداز ند در سر بجز سر کشی　　دوا نیست الا کہ لشکر کشی

اس جگہ یہ بتانا بیجا نہ ہوگا کہ ہندوستان میں حبشیوں کی آمد کی تاریخ کافی قدیم ہے۔ ان کا زور دہلی اور بنگال میں بھی رہا۔ دکن میں عہدِ بہمنیہ میں ان کے قدم اچھی طرح جم گئے تھے۔ حتیٰ کہ انھوں نے سر اٹھانا بھی شروع کر دیا تھا۔

محمود شاہ بہمنی کے دور (۱۴۸۲-۱۵۱۸ء) میں دستور دینار گلبرگہ کا گورنر تھا۔ اس نے بے کار حبشیوں کو اکٹھا کر کے ایک طاقتور فوج تیار کر لی تھی۔ البتہ بادشاہ نے بہ نفس نفیس جا کر اس کی بغاوت کو ختم کیا۔ ارکین سلطنت اور وزرائے گرامی کی درخواست پر دستور دینار کو جان کی امان ملی اور وہ دوبارہ مال و دولت سے بحال ہوا۔ ضلع گلبرگہ میں ساغر نامی مقام پر دستور دینار اور اس کے خاندان والوں کے تعمیر کردہ کئی آثار ہیں۔ ان آثار کے کتبات[1] سے

---

[1] Bibliography of muslim Insoriphins in India -by Berdre (By-Uvi) PP78-18

. معلوم ہوتا ہے کہ دستور دینار اور اس کے خاندان ساغر (نصرت آباد) پر ۹۱۰ھ/ ۱۵۰۴ء تک قابض رہا۔

عیانی کے بقول محمود شاہ بہمنی کو جب دستور دینار حبشی کی بغاوت کا علم ہوا تو وہ آگ بگولہ ہو گیا۔ وہ ایک لشکر جرار کے ساتھ دو روز کا سفر ایک روز میں قطع کر کے گلبرگہ پہنچا۔ بادشاہ کی فوج نے دشمن کو میدان میں گرد کی طرح اڑا دیا۔

عیانی باغیوں کے سردار (دستور دینار) کے بارے میں مزید معلومات بہم پہنچاتے ہوئے لکھتے ہیں کہ وہ ایک مشہور و معروف شخصیت ہے۔ یہ باغی ضلع گلبرگہ کے (ساغر) نامی گاؤں میں محصور تھا۔ اس کے پاس مال و زر کی فراوانی تھی عیانی نے کس خوبصورت انداز میں اس باغی کو درم و دینار کی رعایت سے متعارف کیا ہے۔ ملاحظہ کیجئے:۔

سر سرکشان آن بر آورده نام ۔۔۔ کہ گلبرگہش بود و ساغر مقام

بسے بود مال و زر و لشکرش ۔۔۔ درم بود و دینار در ساغرش

اس مردود نے بادشاہ کے ساتھ سخت کلامی کی جرأت کی اور پیغام بھیجا کہ دکن کی سلطنت اسے تفویض کی جائے ؎

کہ ما را حکومت دہ دکن بزرگ ۔۔۔ اگر تاج خواہی بکن ترک ترگ (کذا)

. اس کمبخت، کم ظرف باغی نے برسوں شاہی نمک کھایا تھا۔ لیکن اس نے حق نمک ادا نہیں کیا۔ بالآخر نمک حرامی ہی اس کے گلے کا طوق ثابت ہوئی۔ چند[1]

[1] فرشتہ کے بموجب ۹۱۰ھ/ ۱۵۰۴ء میں دستور دینار قتل کر دیا گیا تھا (اردو ترجمہ ص ۵۷۶) (بقیہ ص ۴۱ پر)

منافقوں نے اس کے ساتھ ساز باز کر لیا اور اس طرح اس کی فوج دس ہزار حرام خوروں پر مشتمل ہو گئی ؎

فزون بود شان لشکر از دہ ہزار ۔۔۔ سواران سلطان ۔۔۔ بر قرار (کذا)

البتہ دو باغی سرداروں نے اپنی غلطی کا اعتراف کیا اور بادشاہ کے حضور میں پہنچ کر جان بخشی کے خواستگار ہوئے ؎ بقول شاعر:۔

ولیکن دو سردار کہ نزدیک بود ۔۔۔ رسیدند بادشاہ جان بخش زود

عیانی نے بادشاہ کے جرار لشکر کے لاتعداد ہونے کا اشارہ کیا ہے اور مزید لکھا ہے کہ لشکر میں ترک جانبازوں کی بہتات تھی۔ ترکی جنگجو سوار دشمن پر آندھی و طوفان کی طرح ٹوٹ پڑتے تھے۔ یہ مشاہدہ کرتے ہوئے بھی اس ملعون جیوش جیوش نے اپنا لشکر آگے بڑھایا ؎

جیوش جیوش سیہ دل چو میغ ۔۔۔ کشیدند بہ لشکر شاہ تیغ (کذا)

(بقیہ ص ۴۰) مملوکہ مہاراشٹر کالج، بمبئی ۸، تاریخ فرشتہ کے اردو ترجمہ میں دستور دینار کا پہلا حوالہ صفحہ ۵۹۶ پر آیا ہے۔ جب دستور دینار خواجہ سرا اور دیگر حبشی امیروں نے (ملک حسن) کے خلاف محمود شاہ بہمنی کے کان بھرے تھے۔ اسکے بعد صفحہ نمبر ۵۰۶ پر فرشتہ لکھتا ہے کہ دستور دینار حبشی جو قطب الملک دکنی کے جنگ میں کام آنے کے بعد ورنگل کا طرفدار ہوا تھا معزول ہوا اور سلطان محمد شاہ بہمنی کے عہد کے محمد قوچ حسن آباد، گلبرگہ اور ساغر مع مضافات اس کے جاگیر پائی۔ تمام منصبداروں کو دستور دینار کی جماعت سے جدا کیا گیا ص ۵۷۶۔ دستور دینار قاسم برید کی اس تحریک سے ناراض ہوا اور باتفاق عزیز الملک دکنی کے علم مخالفت بلند کیا ص ۵۷۶ اور سات آٹھ ہزار حبشی اور دکنی فراہم لا کر جہت مملکت تلنگ، یہ کہ ولایت گلبرگہ کے نزدیک تھی شاہ کے بلا حکم متصرف ہوا ص ۵۷۶

لیکن دورانِ جنگ بادشاہ کا اقبال بلند تھا۔ اس کے لشکر کا ایک تیغ زن "سورج" اپنی تمازت کی برچھیوں سے دشمن کے سینوں کو چیر رہا تھا۔ بادشاہ دکن کی سرخروی قابلِ رشک تھی کیونکہ بادشاہ کی جانب سے 'خورشید' بدستِ خود تیغ زن تھا۔ ؎

دران روز بہر شہہ کامیاب	بدشمن بسی تیغ زد آفتاب
بہ بین حشمت و جاہ شاہ دکن	کہ خورشید او راست یک تیغ زن

بالآخر دشمن کی جان کے لالے پڑ گئے اور شاہی عتاب کو دیکھ کر رشک و حسد کے مارے زمین انگشت بدندان ہو گئی ؎

عدو را چناں ترس جان گرفت	کہ انگشت زمین را بدندان گرفت

بادشاہ وقت محمود شاہ بہمنی کی فتح یقینی تھی کیونکہ اس کی تلوار پر "نَصْرٌ مِّنَ اللّٰہ" کندہ تھا۔

بشمشیر آن شاہ والا گہر	نوشتست "نَصْرٌ مِّنَ اللّٰہ" بہ زر

عیانی نے فیلبانوں کی کارگزاریوں کا خصوصی طور پر تذکرہ کیا ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ بادشاہ کی کامیابی اور فتحمندی کا سہرا فیلبانوں کے سر ہے۔ ایک جانباز فیلبان نے جس کا ایک ہی ہاتھ تھا۔ ہاتھی کو چابکدستی سے دشمن کے قلب میں پہنچا دیا تھا۔ اس معذور مگر بہادر فیلبان نے جوانمردی کے جوہر دکھائے تھے۔ بادشاہ کے مست ہاتھیوں کے کرتب نے دشمن کو بے بس کر دیا تھا۔ ان ہاتھیوں کی بدمستی اور طوفان خیزی سے اٹھنے والا گرد و غبار دشمن کی آنکھوں کے لیے نمک بن کر کھٹکا تھا ؎

غبارے کہ صحرا و میدان گرفت	نمک گشت و در چشم ایشان گرفت

بالآخر خونریز جنگ کے بعد میدان بادشاہ کے ہاتھ آیا تھا اور نمک حرام دستور دینار

زندہ گرفتار کر لیا گیا تھا ؎

گرفتند دستور برگشتہ بخت	ببستند پایش بزنجیر سخت

نہایت خونریز جنگ کے بعد مفسد دستور دینار کا مال و متاع چھین لیا گیا اور شاہی خزانہ میں جمع کیا گیا۔ باغی دستور کے گرفتار ہونے کے بعد دیگر سرکشوں کی گوشمالی کی گئی اور بادشاہ نے گلبرگہ کی راہ لی۔ بادشاہ نے اہل گلبرگہ کو بے خوف و خطر تجارت کرنے اور عمارتیں بنوانے کی اجازت دی۔ رعایا کے لیے عیش و طرب فراغت اور خوشحالی کے دروازے کھول دیے گئے، امیروں اور غریبوں کی طرف توجہ کی گئی، زر و مال کے صندوق، فلاح و بہبود کے لیے رعایا پر نچھاور کر دیے گئے ان کی دعاؤں اور خیر و برکت کی وجہ سے بادشاہ کی عمر میں اضافہ ہوا[1]

---

[1] جنگ گلبرگہ و ساغر کے متعلق فرشتہ نے حسب ذیل تفصیل درج کی ہے۔ "محمود شاہ بہمنی نے قاسم برید کی صلاح و ہدایت سے یوسف عادل خاں سے کمک طلب کی، یوسف عادل خاں نے لشکر روانہ کیا۔ ادھر دستور دینار حبشی اور عزیز الملک باتفاق جمیع امرائے دکنی اور حبشی قصبہ مہندری کے قریب صفوف، حرب سے آراستہ ہو کر شاہ کے مقابل آئے۔ سنہ ۸۹۷ھ سردار میمنہ یوسف عادل خاں کے سخت حملوں سے باغیوں کو شکست ہوئی اور دستور دینار حبشی زندہ اسیر ہوا اور شاہ نے اس کے قتل کا حکم صادر فرمایا اور آخر کو یوسف عادل خاں کی سفارش سے اس کی جان بخشی ہوئی، گلبرگہ، ساغر اور النند اسے لوٹا دیا گیا۔ لوٹا ہوا مال و متاع بھی بخش دیا گیا اور قلعہ ساغر کی طرف روانہ کیا۔ سنہ ۹۰۳ھ میں دستور دینار نے یوسف عادل شاہ کے ساتھ دوبارہ سر اٹھایا

سنہ ۸۹۷ھ دستور دینار نے قاسم برید اور یوسف عادل شاہ کے درمیان مخاصمت (بقیہ ص ۴۴ پر)

مندرجہ بالا تفصیل کے بعد عیانی نے عہد محمود شاہی کے دس[1] نامی گرامی وزیروں اور دو[2] سورماؤں کا خصوصی طور پر ذکر کیا ہے۔ عیانی نے ان مشہور و معروف ہستیوں کی ذہانت، فطانت، تدبر، سیاسی و سماجی حکمت عملی پر مختصر تبصرہ بھی کیا ہے۔ ان میں کچھ ایسے سیاست داں بھی شامل ہیں جنھوں نے تاحیات بہمنی حکومت کے ساتھ غداری نہیں کی اور ان میں قاسم برید جیسا سیاستداں اور غاصب بھی شامل ہے جس نے بہمنی حکومت کے بجھتے ہوئے چراغ سے اپنی خود مختاری کی شمع روشن کی۔ اس کے برخلاف سلطان قلی (قطب الملک) بہمنی حکومت کا سچا نمک خوار رہا، اس نے اپنے آقا کی رحلت تک اپنی خود مختاری کا اعلان نہیں کیا۔ بقیہ صوبیداروں (نظام الملک (احمد نگر)، عماد الملک (برار) وغیرہ نے اپنی آزادانہ حکومت کا اعلان محمود شاہ بہمنی کی حیات میں کر دیا تھا۔ بہرکیف گلبرگہ اور ساغر کی فتح کے دوران

(بقیہ ص ۴۳) پیدا کر دی۔ ۹۰۴ھ میں عادل خاں نے دستور دینار پر فوج کشی کی۔ قاسم برید نے اسے ملک احمد نظام الملک کی امان میں جانے کا مشورہ دیا۔ یوسف عادل خاں نے بیدر کا رخ کیا۔ محمود شاہ بہمنی خوفزدہ ہو گیا۔ اس نے نظام الملک بحری کو دستور دینار کی اعانت سے روکا بہرکیف سلطان کے اشارہ کے بموجب یوسف عادل خاں نے اس سال دستور دینار کو جان کی امان دی ص ۵۰۶ ۔ ۹۱۰ ہجری میں قاسم برید فوت ہوا۔ امیر برید بن قاسم برید تخت نشین ہوا۔ اس نے سلطان محمود شاہ بہمنی کو بے دخل کر دیا۔ اسی سال یوسف عادل خاں نے فرصت پا کر میاں محمد، خلف الصدق عین الملک کے ہمراہ گلبرگہ گیا اور دستور دینار سے جنگ کر کے اسے ۹۱۰ھ میں قتل کیا اور اس کی جاگیر پر قابض ہوا ص ۵۰۶

"تاریخ فرشتہ" اردو، مطبع نولکشور، لکھنؤ، ۱۹۳۳ء (کتبخانہ مہاراشٹر کالج، بمبئی/۸)

مندرجہ ذیل سپہ سالار اور سرباز محمود شاہ بہمنی کے لشکر کے ساتھ موجود تھے، جنکی مساعی جمیلہ سے بادشاہ کو فتح و نصرت حاصل ہوئی تھی۔

۱۔ برید الملک۔ وزیر حکومت (قاسم برید)

۲۔ در شجاعت عادل خاں سوائی۔ ایک نامی گرامی جنگجو پہلوان (عادل شاہی سلطنت کا بانی)،

۳۔ در مدح ملک فتح الملک۔ یہ بہادر عادل خاں سوائی کے ہمراہ آیا تھا۔

۴۔ در تعریف خانجہان۔ ؟

۵۔ در مدح ملک عین الملک۔ متوفی ۹۰۳ھ (ترکی پہلوان)، عین الملک کنعانی جسے خواجہ بہادر گیلانی کی جاگیر دی گئی تھی۔

۶۔ در تعریف ملک قطب الملک۔ (سلطان قلی) ترکی سردار۔ (ملک قطب الملک ہمدانی) فرشتہ ص ۵۰۰۔

۷۔ در (") پہلوانی جہانگیر خاں۔ ولد قاسم برید (برید الملک) فرشتہ ص ۵۰۰

۸۔ در صفت الغ خان وزیر کبیر

۹۔ در مردانگی ملک مبارز الملک۔ ؟

۱۰۔ فخر الملک۔ فخر الملک دکنی، المخاطب بہ خواجہ جہاں ص ۵۰۵ پرندہ اور شیولاپور کا جاگیردار۔

۱۱۔ ملک بہجت الملک۔ ؟

عیانی نے مندرجہ بالا وزرا و حکومت کی مجموعی تعریف کرتے ہوئے لکھا ہے کہ یہ لوگ جملہ خصوصیات کے مالک تھے۔ چنانچہ کہتا ہے ؎

وزیران کہ بودند ہمراہ شاہ چو اختر نمودند بر گرد ماہ

وزیران سلطان نہ دارند حد	حسابش ندانند کسے جز احد
وزیران دانائے قابل ہمہ	بمردی برستم مقابل ہمہ
بصف در دلیراں چو[1] کردہ اند	چہ گویم کہ شیران چہا کردہ اند
وزیران کامل عمل، پُر خرد	کہ ہر یک ز باغ امل برخورد
وزیرند دہستند سلطان نشان	کہ بادا فزون عمر سلطان شان
حکومت بہ عدل آنچنان میکنند	کہ ویرانی ہا را جناں میکنند
شوم یک بیک را چو مدحت طراز	سخن گردد القصہ دور و دراز

کنم وصف این آصفان اند کے

ہزار اند و من گویم از صد یکے

عیانی نے مندرجہ بالا خصوصیات کو وزرا حکومت کے ناموں کے ساتھ فرداً فرداً تحریر کیا ہے اور اس طرح فتح نامہ کو طول دیا گیا ہے۔ البتہ ایک حیثیت سے عیانی کے فتح نامہ کو تاریخ فرشتہ پر فوقیت حاصل ہے۔ فرشتہ کے یہاں خان جہان، ملک مبارز الملک، الغ خاں اور ملک بہجت الملک کا کہیں ذکر نہیں ہے۔ عیانی نے ان وزراء کی لیاقت اور شجاعت کا تذکرہ بھی کیا ہے جو تاریخی لحاظ سے ایک خاطر خواہ اضافہ ہے۔ ملاحظہ کیجئے:

(۱) در دلیری ملک بہجت الملک :۔

ملک بہجت الملک نیکو سیر	کہ یابد گذر تیر او از سپر
ہمیشہ بہجۃ الملک کامش بود	ازان بہجۃ الملک نامش بود

---

[1] چورہ۔

چو با لشکر خصم شد رو برو	نیاورد از آنہا یکے رو برو[1]

(۲) خانجہاں :۔

دگر خان فرخندہ جان جہان	کہ او را خطابست خان جہان
مخواہید خان جہانش بنام	بگوئید جان جہانش تمام
سر خصم می زد بہ شمشیر او	تو گوئی کہ می باخت چوگان و گو[2]

(۳) در صفت الغ خان :۔

الغ خان اعظم وزیر کبیر	کہ دارد عطا ..... صغیر کذا
بہ علم است در جملہ عالم علم	بدستیش تیغ و بدستے قلم
وزیر خرد مند صاحب دلست	کہ مقصود خلقی از و حاصلست[3]

(۴) در مردانگی ملک مبارز الملک :۔

مبارز بود ملک را سروری	شجاعی، کرمی، ہنر پروری
کند تیر او رخنہ در کوہ قاف	کند کاف را ہمچو کاف از شگاف
چو شمشیر بیرون کشید از غلاف	تن خصم در خون کشید از خلاف
بود ہمنشین بحر و افلاک فلک	خطابش ز سلطان مبارز الملک[4] (کذا)

وزرائے حکومت کی بہادری اور شجاعت کے تذکرے کے بعد بادشاہ "ساغر" کے مضبوط قلعہ کی طرف رجوع ہوتا ہے ۔ بقول عیانی

کہ اندیشۂ فتح ساغر کنید	بیاری حق فتح دیگر کنید
وزیران نہادند سر بر زمین	کہ خواہد شد .... فتح چنین (کذا)

---

[1] تا [4] از فتح نامہ محمود شاہی از عیانی۔ (مختصر)

ز گلبرگہ شہ راہ ساغر گرفت — بعشرت ہمہ راہ ساغر گرفت
کسان ز قلعہ ہای جا داشتند — بسے خوف و اندک رجا داشتند
چو دیدند جان بخشی و لطف شاہ — کہ بخشید یک بندہ را صد گناہ

قلعہ "ساغر" پر چڑھائی اور فتح کا نقشہ عیانی نے کس چابکدستی سے کھینچا ہے ملاحظہ کیجئے:۔

در فتح قلعۂ ساغر

۸۹۸ھ

چو شاہ جوان بخت آنجا رسید — در قلعہ را ساخت نیرہ کلید
بفرمود تا تیر باران کنند — بُن و بیخش از تیر باران کنند
درون رفت در قلعہ تیر سیاہ — بہرون آمد از قلعہ فریاد و آہ
بسے نان و نعمت وران قلعہ بود — ولے آب از دیدہا می کشود
ز بر بادی اول بجنگ آمدند — ز کم آبی آخر بہ تنگ آمدند
ز خان و ملوک آنکہ سردار بود — از ایشان سر و خم بردار بود کذا
غنیمان چو در قلعہ در ریختند — غنیمت بہشتند و بگریختند
بنائے دگر بود از ترس شاہ — گرفتند القصہ آنجا پناہ
بعجز و تضرع بہ پیش آمدند — دل و دیدہ خون سینہ ریش آمدند
گر اول بہ اعدا بسے ہول داد — ترحم نمود آخر و قول داد

شاہی قہر و عتاب کا تیر کمان سے نکل چکا ہوتا ہے۔ دستور دینار کے قتل کا

اعلان ہو چکا ہوتا ہے لیکن ابھی شفاعت و عفو کا دروازہ بھی کھلا ہوا ہے۔ تمام وزرائے نیک نام بادشاہ کی حضور میں قدیم نمک خوار دستور دینار اور اس کے ساتھیوں کے لیے عفو اور جان بخشی کے خواستگار ہوتے ہیں اور دست بدستہ عرض کرتے ہیں ؎

برید و سوامی و دگر فخر ملک — کہ دارند از ہر سہ صد فخر ملک
شفاعت کنان پیش سلطان شدند — بپایش چو در پاک غلطان شدند
کہ شاہا تو شاہی و ما بندہ ایم — بحکم تو سر پیش افگندہ ایم
بکش مال مالے مکش تیغ تیز — غلامان خود را مکش از ستیز کذا
خطای فتد بندگان را بسے — غلامان خود را نہ کشتہ کسے
خطای اگر رفت ازان درگذر — از و مال بستان و از سر گذر
گناہش بہ بخشد خداوند پاک — اگر شاہ این جرم بخشد چہ باک
طلب کرد دستور را در زمان — کہ دادم ترا از بد بہا امان
بسے داشت دینار و مال و درم — تو این شاہ را بین و لطف و کرم
بہر مال خود را سلامت بدر — دگر ہم ببخشم بہ روح بدر
نہ دستور بخشید تنہا و بس — بہ دستور بخشید بسیار کس

محمود شاہ بہمنی کی عفو و بخشش اس کی مصلحت اندیشی اور اس کی سیاسی سوجھ بوجھ کا پتہ دیتی ہے اس سے بادشاہ کی نیک نیتی اور رعایا پروری کا بھی اندازہ ہوتا ہے بادشاہ نہ صرف باغی کی جان بخشی کرتا ہے بلکہ رعایا کی فلاح و بہبود کے پیش نظر ضبط شدہ مال بھی نذرانے کے طور پر دے دیتا ہے۔ یہ تمام خوبیاں بادشاہ کی

دور اندیشی، اعلیٰ ظرفی ہمت اور سیاسی تدبر کا ثبوت ہیں۔

اس کے بعد عیّانی نے بادشاہ کے پایۂ تخت بیدر کو لوٹنے کا مفصل حال بیان کیا ہے، بادشاہ کی بخششوں اور عطاؤں سے ہر طرف مسرت، شادمانی اور انبساط کی لہر دوڑ گئی ہے۔ چنانچہ وہ کہتا ہے ؎

چو زاغ سیہ صد شہ باز گشت — ز ساغر فرحناک شد باز گشت
ز ساغر بخوش وقتی و خرمی — بہ درہم مبدل شدہ درہمی
نہادند رو سوی بیدر ہمہ — اشر کردہ جام طرب در ہمہ
ہمہ رہ بہ عیش و سرور آمدند — بجاہائے دلکش فرود آمدند

شہر بیدر بادشاہ کے خیر مقدم کے لیے کس قدر جوش مسرت سے بے تاب اور منتظر ہے۔

ہمہ شہر تا کوچہ آراستند — دکانہا بزر یلوجہ پیراستند
علم از زمیں سر بگردون کشید — قلم این الف راستی چون کشید
شد از مقدم شاہ فرخندہ فر — مشرف بہ تشریف دیدار و در
چو در خانہ رفتند از گرد راہ — بعشرت نشستند شاہ و سپاہ

بادشاہ وقت خداوند تعالیٰ کی بارگاہ میں سجدۂ شکر بجا لاتا ہے۔ اسکے بعد عیّانی "در بہبود اوضاع زمانہ" کے عنوان سے چند اشعار کہتا ہے۔ جس کا مضمون حسب ذیل ہے ؎

.... شاہ عالم بلطف و کرم — کند ملک بیدر چو باغ ارم
بہ بینی کہ از دولت بادشاہ — شود ہر گدا صاحب مال و جاہ

شود ملک بیدر چو خلد برین — و ہر جملہ دلہا گواہی برین
بہ اقبال سلطان و عقل وزیر — شود راست کار ممالک چو تیر

عیّانی کی دور بینی اور مصلحت کوشی قابل ستائش ہے۔ اس نے سلطنت بہمنیہ کے خاص مشیر اور سیاہ و سپید کے مالک' قاسم برید (ملک برید الملک) کی علٰحدہ سے مدح کی ہے۔ قاسم برید دراصل وزیر کل تھا۔ اس کے ہاتھ میں سلطنت کی باگ ڈور تھی، مورخین کے اندازہ کے مطابق جنگ ساغر، آخری لڑائی تھی جس میں بہمنی بادشاہ نے اپنے اقتدار کا عملی طور پر استعمال کیا تھا۔ اس کے بعد بادشاہ کے حقوق کم سے کم تر ہوتے گئے اور بعد کے بادشاہ برائے نام بادشاہ کہلائے

عیّانی نہ صرف شاعر تھا بلکہ نباض وقت بھی تھا۔ اس نے برید الملک کے روشن مستقبل کا اندازہ لگا لیا تھا۔ لہذا مدحیہ اشعار میں ایک جگہ یہانتک کہہ دیتا ہے کہ سارا ہندوستان برید الملک کے زیر نگیں آجائے تو بہتر ہے۔ چنانچہ قاسم برید کی تعریف و توصیف میں عیّانی کی خوشنوائی ملاحظہ فرمائیے :-

در مدح مسند عالی ملک برید الملک

معظم برید الممالک بود — کہ بر ملک تدبیر مالک بود
بود عقل و تدبیر او پیر او — نیفتد وزیرے بتدبیر او
چنان خواہش ساخت سلطان بزرگ — کہ باشد بفرمانش ہند و ترک
بقولش ہمہ کس کنند اعتبار — بخوبی دہد مملکت را قرار
ہمہ سلطنت در وزارت کند — ہمہ مملکت را عمارت کند
شود ملک ہندوستان ملک او — بیک حرف دہ دہ دہد کلک او

الٰہی کہ عمرش درازی کند   وزارت بہ او سرفرازی کند

بہ او این وزارت مبارک بود

نگہ دار جانش تبارک بود

اس کے بعد عیانی نے بادشاہ کی شادمانی، کرم گستری اور اسباب غم کی طرف اشارہ کیا ہے ۔ جنگ وجدال کی وجہ سے بادشاہ کبیدہ خاطر ہو گیا تھا ۔ لہٰذا بادشاہ کو شادماں اور فرحاں کرنے کے سامان پیدا کیے گئے چنانچہ عیانی رقمطراز ہے ؎

چناں جنگی دل شکستہ نواخت   کہ بر چنگ زر رشتہ زنار ساخت (کذا)

زنائے زرین نے زنان نے زدند   حریفان زسیمیں قدح مئی زدند

نوائے دف وچنگ تا زہرہ رفت   زفریاد شان زہرہ را زہرہ رفت

بادشاہ کی کرم گستری کا یہ حال تھا کہ ؎

کرم ہائے شہ کاندکے گفتہ ام   چہ گویم یکے از لکے گفتہ ام

زانعام عامش بہ خلق جہان   عیانست و حاجت ندارد بیان

بادشاہ کے عدل وانصاف کے ذکر میں عیانی کی خوش بیانی ملاحظہ کیجیے۔

چو گفتم ز آوازۂ بذل او   درآییم ز دروازۂ عدل او

درختیست عدلش بر از شاخ و برگ   کہ از میوہ اش جملہ پابند برگ

زعدلش شبان بیرہ را شیر شیر   دہد آن قدر کہ شود شیر سیر (کذا)

بادشاہ کی شجاعت اور فتحمندی کا ذکر کرتے ہوئے عیانی بادشاہ سے خطاب کرتے ہیں اور نہایت عاجزی وانکساری کے انداز میں کہتے ہیں ؎

شہا تخت وملک از تو راستی   ترا می رسد سلطنت راستی (کذا)

گل وگلستان غریبان توئی   نوا بخش این عندلیبان توئی

بود تن بجان زندہ اندر جہان   غریبان بتو زندہ چون تن بجان

تو دریائی و ما ہمہ قطرہ ایم   تو خورشیدی و ما ہمہ ذرہ ایم

بادشاہ سے خطاب کے بعد عیانی نے اپنے مزاج اور موقع کے اعتبار سے ایک عمدہ اور خوبصورت عنوان کا انتخاب کیا ہے ۔ اس عنوان کے تحت اس نے شعر وسخن کی اہمیت وماہیت پر روشنی ڈالی ہے ۔ سخن سنجی اور سخن فہمی کے لوازم پر تبصرہ کیا ہے ۔ اس بیان میں عیانی خودستائی سے بھی کام لیتا ہے۔ عیانی تعلی آمیز انداز میں فتح نامہ اور اس کے اشعار کی خوبیوں کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ "سخن" سے متعلق عیانی کا نظریہ کافی غور طلب ہے ۔ وہ کہتا ہے کہ سخن پاک وشفاف گوہر کی طرح ہے ۔ یہ عرش اعلیٰ کا مکین ہے۔ سخن اہل دل کی جان شیریں ہے اور ہر محفل کی شمع رنگین ہے ۔ سخن ایک نئی نویلی دلہن کی طرح ہوتی ہے ۔ اس کا جاذب نظر چہرہ الفاظ کے گھونگٹ کے تلے پوشیدہ رہتا ہے ۔ عیانی کا اعتراف ہے کہ وہ ایک اعلیٰ پایہ کا سخن گو ہے اور سخن گوئی اس کا شیوہ ہے ۔ مندرجہ بالا خیالات کو عیانی کی زبانی سنیے ؎

در تعریف سخن و نام نامہ

نوشتم در اوصاف شہ نامہ   کہ باشد ز انصاف شہ نامہ

نہ در حبت این نامہ یا دفتریست   کہ ہر صفحہ درج پر گوہریست

درے چند بر آب غلطان بود   کہ شائستہ گوش سلطان بود

سخن آمد از عرش بالا فرود   چو باران رحمت ز بالا فرود

سخن چون شاخ زبان سر کند — لبالب دہان پر ز شکر کند
سخن جان شیرین اہل دلست — سخن شمع رنگین ہر محفلست
سخن نو عروسی بود ماہ رو — کہ بنماید از پردہ ناگاہ رو
سخن قیمت مرد افزون کند — ... ہر کسے تا سخن چون کند (کذا)
عیانی سخن گو کہ این کار تست — چہ غم کہ حسودے در کار تست
سخن نو عروسیت اما چہ سود — کہ ایمن نباشد ز چشم حسود
ببر کردہ از شعر وز در لعین — عروس سخن جامۂ کاغذین
رخ وز دبد گوئے نادید نیست — چنیں چنیں نکوے در دید نیست (کذا)
چو کلکم بکافور بر مشک سود — زدم خاک تیرہ بچشم حسود
گیم من کہ این ہا توانم سرور — ز غیب آید این ہا بجانم فرود
اگر خاک گوید سخن بندہ ام — کہ این دم بباید ز حق زندہ ام
مزن طعنہ بر دوستان کسے — کہ گوید سخن از زبان کسے
نمودم بہ امید شاہ اہتمام — کہ شد فتح نامہ بنامش تمام

عیانی کے اشعار غماز ہیں کہ انکے کئی حاسد تھے۔ عیانی کی لیاقت، لطافت اور سخن گوئی باعث رشک تھی۔ بادشاہ تک براہ راست ان کی رسائی بھی حاسدوں کو پسند نہیں تھی۔ البتہ عیانی نے ان کینہ پروروں کی آنکھوں میں اپنی خوش خلقی اور خوش بیانی کے ذریعہ دھول جھونکی چنانچہ کہتے ہیں ؎

چو کلکے بکافور بر مشک سود — زدم خاک تیرہ بچشم حسود

عیانی طعنہ زنی کو سفلگی تصور کرتے ہیں لہٰذا دوستوں اور دشمنوں پر طعنہ زنی سے باز رہتے ہیں اور یہ اعلان کرتے ہیں ؎

مزن طعنہ بر دوستان کسے — کہ گوید سخن از زبان کسے

بادشاہ سے صلے کی تمنا کے ساتھ "فتح نامہ محمود شاہی" کا اختتام ہوتا ہے۔ چنانچہ عیانی کے حسن طلب کا انداز ملاحظہ کیجئے :۔

نمودم بہ امید شاہ اہتمام — کہ شد "فتح نامہ" بنامش تمام

اسکے بعد عیانی نے بارہ دعائیہ اشعار کہے ہیں اور "فتح نامہ محمود شاہی" کو ختم کیا ہے۔

بنور عنایت شبش روز کن — ہمہ روز او عید و نوروز کن
چہ خواہد دلش اے کسی بے کسان — مراد دل او تو با او رسان

کتابیات :۔

(۱) تاریخ سلاطین بہمنیہ از ہارون خان شروانی (۲) اے شارٹ ہسٹری آف پرشین لٹریچر، دیدرے ٹی، این (۳) این اورینٹل بائیوگرافیکل ڈکشنری از ٹی، ڈبلو بیل ۱۹۷۱ء (۴) ببلیوگرافی آف مسلم انسکرپشنس ان انڈیا از بندرے (۵) افریقن ڈیسپورا ان انڈیا، اسلامک کلچر، عمر خالدی، حصہ ۱ و ۲، ۱۹۸۹ء امریکہ (۶) کلیات عیانی، اورینٹل مینسکرپٹس، انسٹی ٹیوٹ، مدراس یونیورسٹی، مدراس نمبر ۲۰۸ (۷) ڈسکرپٹیو کیٹلاگ آف اسلامک مینسکرپٹس، مدراس یونیورسٹی از شاستری ۱۹۳۹ء (۸) دیوان حافظ شیرازی (۹) تاریخ گولکنڈہ، عبدالمجید صدیقی (۱۰) قطب شاہی دور کا فارسی ادب از اختر حسن (۱۱) تاریخ فرشتہ از فرشتہ اردو ترجمہ، نولکشور، لکھنؤ ۱۹۳۳ء (مہاراشٹر کالج، بمبئی ۸) (۱۲) تذکرۃ الملوک : بمبئی یونیورسٹی، لائبریری بمبئی۔ (۱۳) دی کریٹیکل اسٹڈی آف انڈو پرشین لٹریچر (سید اور لودھی خاندان کے عہد میں) ۱۴۱۴ء تا ۱۵۲۶ء از سیدہ بلقیس فاطمہ حسینی (۱۴) بزم مملوکیہ از سید صباح الدین عبدالرحمٰن (۱۵) دی ہسٹری آف پرشین لینگویج اینڈ لٹریچر از پروفیسر ایم، اے۔ غنی الہ آباد (۱۶) بہمنی سلطنت از ظہیر الدین، حیدر آباد (۱۷) ہسٹری آف میڈول دکن، سیکشن، پانچ، ڈاکٹر نذیر احمد مرتبہ ایچ کے شروانی (۱۸) متعدد تذکرے اور فہارس مخطوطات (۱۹) نثر و نظم فارسی در زبان قطب شاہی از رضیہ اکبر، حیدر آباد (۲۰) صدیہ از صدر جہان ملا حسین الطبسی مرتبہ راقم (۲۱) کلیات دیوان، شاہ نعمت اللہ ولی کرمانی مرتبہ از محمد عباسی : ایران ۱۳۶۳ھ۔

حکیم علی گیلانی، ایک نامور طبیب اور ریاضی داں

از حکیم الطاف احمد اعظمی[1]

اکبر کا عہد (۱۵۵۶-۱۶۰۶ء) اس اعتبار سے ممتاز ہے کہ اس میں مختلف علوم وفنون کے ارباب کمال بڑی تعداد میں وسط الیشیاء بالخصوص ایران سے ہندوستان آئے اور اکبر کے دربار میں ملازمت حاصل کی۔ اکبر کی علم نوازی اور علماء پروری اس آمد کا ایک بڑا سبب تھی۔ حکیم علی بھی بادشاہ کی قدردانی، علم کی شہرت سن کر ہندوستان آیا اور اس کے دربار سے وابستہ ہوگیا۔ وہ نہایت غربت وافلاس کی حالت میں ہندوستان آیا تھا لیکن اپنے غیر معمولی علم وفضل کی وجہ سے اس نے نہ صرف دربار شاہی میں رسائی حاصل کرلی بلکہ بہت جلد بادشاہ کے مقربین میں شمار ہونے لگا[1] حکیم علی۔ حکیم الملک شمس الدین گیلانی[2] کا بھانجا تھا[3]

مناصب حکیم علی سنہ ۴۰ جلوس اکبری تک ہفت صدی منصب پر فائز رہا[4]۔ صوبۂ بہار کی صدارت بھی اسے ملی تھی[5] لیکن جہانگیر کے زمانہ میں وہ دو ہزاری منصب تک پہنچ گیا تھا[6] مولف ذخیرۃ الخواتین کا بیان ہے کہ وہ سہ ہزاری منصب پر فائز تھا[7] ممکن ہے بعد میں کسی وقت اس کے منصب میں اضافہ ہوا ہو۔

علم و فضل حکیم نے طب کی تعلیم اپنے ماموں حکیم الملک شمس الدین گیلانی اور علامہ

---

(۱) جامعہ ہمدرد، نئی دہلی۔

شاہ فتح اللہ شیرازی سے اور علوم شرعی کی تعلیم شیخ عبدالنبی بن احمد گنگوہی سے حاصل کی[8] حکیم علی کو دوسرے علوم کے ساتھ طب اور ریاضی میں کامل دستگاہ حاصل تھی، مولف ماثر الامراء لکھتا ہے[9]۔

"حکیم علی، علوم وفنون بالخصوص علم طب اور ریاضی میں کامل مہارت رکھتا تھا"

حکیم علی کو ریاضی اور علم نجوم میں جو کمال حاصل تھا اس کا اندازہ جہانگیر کے درج ذیل بیان سے کیا جاسکتا ہے[10]

"حکیم علی کہ دانائے فن ریاضی است، پرسیدم کہ ساعت توجہ من چگونہ بودہ است، بعرض رسانید کہ بجہت حصول این مطلب اگر خواہند ساعتے اختیار نمانید در سالہا مثل این ساعتی کہ بدولت سوار شدہ اند نتوان یافت"

مولف نزہتہ الخواطر نے بھی حکیم کی غیر معمولی ذہانت کا اعتراف کرتے ہوئے لکھا ہے[11]:

"وہ نہایت ذکی وفطین اور صاحب ذہن رسا تھا، باتوں کی تہ تک نہایت آسانی کے ساتھ پہنچ جاتا تھا، اسرار سربستہ کی گرہ کشائی اس کے لیے نہایت آسان تھی، وہ بہت باریک بین واقع ہوا تھا"

حوض حکیم علی حکیم علی علم ریاضی میں جیسا کہ اوپر بیان ہوا، بڑی مہارت رکھتا تھا۔ ۳۹ جلوس اکبری مطابق ۱۰۰۲ ہجری میں حکیم نے لاہور میں ایک عجیب وغریب حوض بنایا تھا جو تاریخ کی کتابوں میں "حوض علی" کے نام سے مذکور ہے۔ اس کا طول وعرض ۲۰×۲۰ گز اور عمق تین گز تھا۔ پانی سے بھرے ہوئے اس حوض میں ایک حجرہ (کمرہ) تھا جو خوب آراستہ اور روشن تھا، دس بارہ آدمیوں کے بیٹھنے کی اس میں جگہ تھی،

اس کے علاوہ سونے کے لیے چارپائی، کھانے کے لیے سامان خورد و نوش اور پڑھنے کے لیے کتابیں بھی موجود تھیں۔ فضا کا دباؤ (Atmospheric Pressure) اس درجہ حیرت انگیز طور پر متوازن رکھا گیا تھا کہ دروازہ کھلا ہونے کے باوجود پانی کا ایک قطرہ حجرہ میں داخل نہ ہو پاتا تھا[12]

اکبر نے جب اس حوض کی شہرت سنی تو اسے دیکھنے گیا۔ اور حوض میں غوطہ لگا کر حجرے میں داخل ہوا۔ کچھ دیر وہاں رکا، کپڑے تبدیل کیے۔ عطر لگایا۔ جو کچھ وہاں موجود تھا اس میں سے کچھ کھایا اور کتابوں کو ملاحظہ فرمایا، کچھ دیر وہاں آرام بھی کیا اور پھر حکیم علی کے ساتھ حوض سے باہر آگیا۔ مولف ذخیرۃ الخواتین نے اس کی تفصیل قلمبند کی ہے[13]

توزک جہانگیری سے معلوم ہوتا ہے کہ حکیم علی نے ایک دوسرا حوض آگرہ میں اپنے گھر کے اندر بنایا تھا۔ اس کا سائز ۶ × ۶ گز تھا۔ تیسرے سال جلوس جہانگیری یعنی ۱۰۱۸ ہجری مطابق ۱۶۰۹ عیسوی میں اس حوض کو دیکھنے کے لیے جہانگیر اپنے بعض رفقاء کے ساتھ حکیم علی کے گھر گیا۔ جہانگیر نے اس حوض کا حال ان لفظوں میں بیان کیا ہے:[14]

"روز یکشنبہ بیست و سوم بخانۂ حکیم علی بتماشائے حوضی کہ مثل آں در زمان حضرت عرش آشیانی در لاہور ساختہ بود با جمعی از مقربان کہ آں حوض را ندیدہ بودند، رفتم۔ حوض مذکور شش گز در شش است و در پہلوے حوض خانہ ساختہ شدہ در غایت روشنی کہ راہ آں خانہ ہم از درون آب است و آب از آں راہ بدرون در نمی آید، دہ دوازدہ کس در آنخانہ صحبت می داشتند، از

نقد و جنس آنچہ در وقت او گنجید پیشکش نمود۔ بعد از ملاحظہ خانہ و در آمدن جمعی از نزدیکاں بر آنجا حکیم را بہ منصب دو ہزاری سرفراز ساختہ بدولت خانہ معاودت نمودم"

حکیم علی کی سفارت

عہد اکبری میں جبکہ اصحاب علم و کمال بڑی تعداد میں موجود تھے کسی شخص کا سفارت کے فرائض کی انجام دہی کے لیے منتخب کیا جانا دراصل اس کی ذہانت، معاملہ فہمی، دور اندیشی اور بادشاہ سے اس کے قرب و اختصاص کی دلیل ہوا کرتا تھا۔ حکیم علی کو ۹۸۸ھ مطابق ۱۵۸۰ء میں علی عادل شاہ اول[15] والی بیجاپور کے پاس بطور سفیر بھیجا گیا۔ جب حکیم بیجاپور پہنچا تو اسے عزت و احترام کے ساتھ شہر میں لایا گیا، عادل شاہ نے اس کا شایان شان استقبال کیا۔ مولف مآثر الامراء نے لکھا ہے کہ ابھی حکیم علی سفارت کے فرائض انجام دے کر واپس بھی نہیں ہوا تھا کہ عادل شاہ کو قتل کر دیا گیا[16] مولف اکبرنامہ کا بھی یہی بیان ہے[17] لیکن تاریخ فرشتہ کے مولف نے لکھا ہے کہ حادثۂ قتل حکیم کی واپسی کے بعد پیش آیا تھا۔ مگر اول الذکر بیان صحیح معلوم ہوتا ہے۔

حکیم علی کی حذاقت

حکیم علی کو فن طب میں کامل مہارت تھی۔ فی الواقع وہ اپنے وقت کا ایک بے نظیر عالم اور حاذق طبیب تھا۔ جہانگیر نے اس حقیقت کا اعتراف ان لفظوں میں کیا ہے:[18]

"حکیم بے نظیر بود، از علوم عربیہ تمام داشت، شرحی بر قانون، در عہد خلافت والد بزرگوارم تالیف نمودہ است"

حکیم مظفر اردستانی کے ذکر میں ایک جگہ لکھا ہے:[19]

"حکیم علی کہ معاصر اُو بود در فضیلت بروز یادتی داشت۔"

یہ تو طب نظری میں حکیم علی کی دسترس کا ثبوت ہے، طب عملی میں بھی وہ یگانۂ عصر تھا۔ مولف مآثر الامراء نے لکھا ہے[٢٠] "وہ ایسے ایسے علاج کرتا تھا کہ لوگ انگشت بدنداں رہ جاتے تھے"۔ شیخ فرید بھکاری نے بھی اس امر کا اعتراف کیا ہے[٢١]:

"وہ بیماروں کا علاج اس طور پر کرتا تھا کہ مخلوق خدا حیرت میں پڑ جاتی تھی اور عقل اسے باور نہیں کرتی تھی"۔

یہ ابتدائی زمانہ کی بات ہے جب حکیم بادشاہ کے زمرۂ اطبا میں شامل ہوا تو اکبر نے ایک روز بغرض امتحان بہت سے قارورے تیار کرائے، کسی میں تندرست آدمی کا، کسی میں مریض کا، کسی میں جانوروں کا اور کسی میں مخلوط پیشاب رکھا گیا، حکیم علی نے ہر قارورہ کا صحیح صحیح حال بتادیا۔ اس سلسلے میں مولف ذخیرۃ الخوانین لکھتا ہے[٢٢]:

"اتفاقاً حضرت آشیانی از سبب امتحان بصارت و نصارت و حکمت اُو در بعضے قارورہ بول مریض و بعضے بول مردم تندرست و در بعضے بول دواب متعدد و در چندے بول مخلوط کردہ بنظر حکیم آوردند۔ حکیم ایں ہمہ را قرار واقعی نشان داد و ایں معنی باعث مزید قرب و اختصاص حکیم گردید۔"

فن طب میں حکیم علی کی غیر معمولی ذہانت و حذاقت کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ وہ خاندان شاہی کا خصوصی معالج تھا۔ اکبر اس کی ذہانت، عملی تجربہ اور تشخیص مرض میں اس کی مہارت پر کامل اعتماد رکھتا تھا۔ کابل سے واپسی پر اکبر گھوڑے سے گر گیا جس سے شدید چوٹ آگئی۔ حکیم علی گیلانی کے علاج سے چند ہی روز میں اچھا ہو گیا۔

مولف اکبرنامہ لکھتا ہے[٢٣]:

"حکیم علی گیلانی ریشہا را بروغنے (کہ از ہندی پزشکان فرا گرفتہ بود) اندود در دو ہماں روز نشان تندرستی پدید آمد۔"

١٠٠٤ھ مطابق ١٥٩٦ء میں اکبر کا محبوب مصاحب اور ملک الشعراء شیخ فیضی ضیق النفس، استسقاء اور اسہال دموی جیسے خطرناک امراض میں مبتلا تھا اور حکیم مصری کے زیر علاج تھا۔ ایک روز آدھی رات گئے فیضی کی حالت زیادہ خراب ہوگئی تو اکبر حکیم علی گیلانی جیسے طبیب حاذق کو ساتھ لے کر فیضی کے گھر گیا، ملا عبدالقادر بدایونی لکھتے ہیں[٢٥]:

"وہنگام نزع او بادشاہ نیم شبی رسیدہ سر او بدست نوازش گرفتہ و برداشتہ چند مرتبہ فریاد زدہ فرمودند کہ شیخ جیو حکیم علی را ہمراہ آوردہ ایم، چرا حرف نمی زنید چوں از خود رفتہ بود آواز وے صدائے و ندائے برنخاست چوں مکرر پرسیدند دستار خود بر زمین زدو آخر ابوالفضل را تسلی نمودہ بازگشتند۔ مقارن ایں حال خبر رسید کہ خود را سپرد۔"

فیضی عالم نزع میں تھا کہ بادشاہ آدھی رات کو اس کے گھر پہنچا اور بنہایت نوازش اس کے سر کو ہاتھ میں لیا اور رکھ دیا پھر فریاد آمیز لہجے میں کہا: شیخ جیو، حکیم علی کو اپنے ہمراہ لایا ہوں بولتے کیوں نہیں؟ چونکہ وہ بیہوش تھا اس لیے جواب نہ دے سکا۔ بادشاہ نے مکرر پوچھا اور اپنی دستار کو زمین پر دے مارا۔ آخر کار ابوالفضل کو تسلی دے کر واپس ہوا۔ جانے کے فوراً بعد خبر پہنچی کہ وہ فوت ہوگیا۔

زندگی کے آخری ایام میں جب اکبر کو مرض اسہال لاحق ہوا تو علاج کے لیے حکیم علی کو طلب کیا گیا۔ حکیم علی نے علاج شروع کیا لیکن افاقہ نہ ہوا۔ ایک روز بادشاہ حکیم پر سخت برہم ہوا اور غصے کے عالم میں اس کی طرف دو قدم بڑھا اور کہا:[25]

"تو ولایت کا ایک معمولی آدمی تھا، غربت و افلاس کی حالت میں ہندوستان آیا اور یہاں تیری غربت دور ہوگئی، تجھے اونچے مناصب اسی لیے دیے گئے کہ مشکل وقت میں کام آئے۔ میرا علاج تو ٹھیک طور پر کیوں نہیں کرتا؟"

بادشاہ کے اس عتاب آمیز تخاطب پر حکیم علی نے اپنے تھیلے سے ایک دوا نکالی اور اسے آبخورے میں ڈال دیا جس سے پانی جم گیا اور پھر عرض کیا: بادشاہ سلامت میرے پاس اس قسم کی دوائیں موجود ہیں، لیکن میں سخت حیرت میں ہوں کہ آپ پر کوئی بھی دوا اثر نہیں کرتی۔ بادشاہ نے عالم اضطراب میں کہا کہ جو کچھ ہونا ہے ہوگا یہی دوا مجھے دو۔ دوا دے دی گئی۔ اس سے دست تو فوراً بند ہوگیا لیکن شدید قبض ہوجانے کی وجہ سے شکم میں تکلیف دہ درد شروع ہوگیا۔ چنانچہ رفع قبض کے لیے دست آور دوائیں دی گئیں جس سے کافی دست آئے اور بالآخر بادشاہ کا انتقال ہوگیا۔[26]

اکبر کی موت کا سبب

اوپر ہم نے جو کچھ لکھا اس سے بالکل واضح ہے کہ اکبر کی موت کا سبب کثرت اسہال تھا جو قبض کشا دوا سے دوبارہ شروع ہوگیا تھا۔ بعض مورخین نے لکھا ہے کہ اکبر کی موت کا سبب حکیم علی کی غلط تدبیر تھی یعنی اس نے اسہال کی حالت میں بادشاہ کو تربوز کھلا دیا تھا جس سے اسہال دموی لاحق ہوا اور بادشاہ مرگیا۔ مولف مآثر الامرا لکھتا ہے:[27]

"اکبر کی بیماری کے آخری دنوں میں حکیم علی نے تربوز تجویز کر دیا تھا۔ چنانچہ جہانگیر نے تخت نشین ہونے کے بعد حکیم علی پر عتاب فرمایا کہ تو نے اسی تجویز (تربوز) سے میرے باپ کو مار ڈالا۔"

مولف مآثر الامرا کا مذکورہ بیان صحیح نہیں معلوم ہوتا۔ اول تو یہ کہ جہانگیر نے تزک میں حکیم علی کے بارے میں بہت کچھ لکھا ہے، اس کی تعریف بھی کی ہے اور اسے باعتبار سیرت ابرا بھی کہا ہے لیکن یہ کہیں نہیں لکھا ہے کہ اس نے تربوز تجویز کر کے اکبر کو مار ڈالا۔ دوسرے یہ کہ حکیم علی جیسے دانا اور فاضل طبیب سے یہ کیسے توقع کی جا سکتی ہے کہ وہ حالت اسہال میں تربوز تجویز کرے گا لیکن اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ اکبر نے تربوز کھایا تھا تو اس سے یہ کہاں ثابت ہوتا ہے کہ حکیم علی کی رائے اور مرضی بھی اس میں شامل تھی۔ یہ عین ممکن ہے کہ بادشاہ نے رفع تشنگی کے لیے جو کثرت اسہال سے یقیناً رہی ہوگی، تربوز کو ٹھنڈا سمجھ کر حکیم علی کے مشورہ کے بغیر کھا لیا ہو اور اس کی یہی بدپرہیزی اس کے لیے جان لیوا ثابت ہوگئی ہو، لیکن بعد کے مورخین نے بادشاہ کی اس بدپرہیزی کو حکیم علی کی تجویز قرار دے کر اسے مورد الزام ٹھہرایا۔

یہ توجیہ ہم نے یہ مان کر کی ہے کہ اکبر نے تربوز کھایا تھا۔ اس باب میں ہماری اپنی تحقیق یہ ہے کہ یہ واقعہ ہی سرے سے غلط ہے یعنی اکبر نے تربوز کھایا ہی نہیں تھا کیونکہ دوسرے مورخین کے بیانات سے اس کی تصدیق نہیں ہوتی مثلاً مولف عمل صالح کا بیان ملاحظہ ہو:[28]

"باوجود چندیں طبیب حاذق کہ سرآمد ایشاں حکیم علی گیلانی بودہ، دوا و

"مداوا سودمند نیفتادہ معالجہ وتدبیر فائدہ ندارد۔"

اقتباس بالا میں "تجویز تربوز" کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ فاضل مولف نے صرف اتنا لکھا ہے کہ سرآمد اطبا اور طبیب حاذق ہونے کے باوجود اس بیماری میں حکیم علی کی کوئی دوا کارگر نہ ہو سکی اور اس کی ہر تدبیر رائگاں گئی۔ اس سلسلے میں اکبر نامہ کے مولف کا بیان بھی ملاحظہ فرمالیں:[29]

"از حکیم علی باز فراواں دعوئ پزشکی دانش، سہو عظیم رفت و بے دانشی او پیدائے برآمد تا ہشت روز تدبیرے نہ کرد تا آنکہ ضعف قوت گرفت و رنجوری تنومندی یافت مرض باسہال دموی کشید و شگرف بیماری روئے داد درین وقت نیز شک بے خود در فکر در افتاد و از ناسازی دانش ہر دوائے کہ در دفع عارضہ بکار برد یاور مرض شد چنیں لغزش آں حکیم در علاج علامۃ الزماں شاہ فتح اللہ شیرازی نیز روئے دادہ بود۔ آنگاہ بادانائے روزگار حکیم ابوالفتح گیلانی و جالینوس زماں حکیم مصری فرمودہ بہ فوت

حکیم علی سے جو بہت زیادہ دعوئ پزشکی رکھتا تھا۔ سہو عظیم سرزد ہوئی اور اسکی بے دانشی کھل کر سامنے آگئی کہ اس نے آٹھ روز تک کوئی علاج نہیں کیا جس سے بادشاہ کی قوت میں بے حد ضعف آگیا اور مرض نے اسہال دموی کی صورت اختیار کر لی۔ یہ ایک عجیب صورت مرض تھی۔ اب غافل طبیب کو فکر لاحق ہوئی لیکن خرابئ دانش سے جو دوا بھی وہ دفع عارضہ کے لیے دیتا تھا۔ بیماری کو بڑھا دیتی تھی۔ اسی طرح کی غلطی اس نے علامۃ الزماں شاہ فتح اللہ شیرازی کے علاج میں بھی کی تھی۔ بادشاہ نے اس نازک گھڑی میں دانائے روزگار حکیم ابوالفتح گیلانی اور جالینوس زماں حکیم

آں دو حکیم ناموتاسف ہا کردند، و روز نوزدہم حکیم در کار مداوا مبہوت شدہ دست از علاج باز کشید و از سطوت قہر شاہی اندیشناک گشتہ یا از مردم حرم سرا ترسیدہ از آں حضرت کہ در غایت ضعف بودند خود را بکنارہ انداخت و در پناہ شیخ فرید بخشی گریخت"۔

مصری کو یاد کیا اور ان کے فوت ہو جانے پر اظہار تاسف کیا۔ انیسویں روز حکیم علی لاچار ہو کر علاج سے دست بردار ہو گیا اور سطوت شاہی کے قہر یا حرم سرا کے لوگوں سے خائف ہو کر بادشاہ سے جو انتہائی ضعف کے عالم میں تھا، کنارہ کش ہو گیا اور شیخ فرید بخشی کی پناہ میں چلا گیا۔

یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ شیخ ابوالفضل جو اکبر نامہ کا مولف ہے اکبر کی زندگی ہی میں وفات پا چکا تھا[30] اس لیے اکبر کی علالت یا اس کی موت کی جو تفصیل اکبر نامہ میں درج ہے وہ ایک دوسرے شخص کی لکھی ہوئی ہے۔ محوائے کلام سے صاف ظاہر ہے کہ اس کا لکھنے والا حکیم علی کا شدید مخالف تھا لیکن اس سے قطع نظر اس مخالف نے بھی تربوز کی تجویز کا الزام عائد نہیں کیا ہے۔ اگر حکیم علی نے تربوز تجویز کیا ہوتا تو اس کا ذکر اکبر نامہ کے اس مولف نے ضرور کیا ہوتا۔ اس لیے ماننا ہوگا کہ تجویز تربوز کا الزام حکیم کے حاسدوں اور بدخواہوں کی افترا پردازی ہے۔

اس میں حکیم علی کی جس سہو عظیم کا ذکر ہے وہ یہ تھی کہ اس نے شروع میں علاج نہیں کیا، لیکن یہ طبی نقطۂ نظر سے سہو عظیم نہ تھا۔ چونکہ مولف اکبر نامہ طبیب نہ تھا۔ اس لیے اس کو سہو عظیم کہہ دیا۔ طب یونانی کا یہ ایک اہم اصول علاج ہے کہ ابتدائے مرض میں علاج نہ کیا جائے بلکہ اسے طبیعت کے سپرد کر دیا جائے جو اصل معالج ہے

جب طبیب یہ محسوس کرے کہ طبیعت مرض کے ازالہ پر قادر نہیں ہو پا رہی ہے تو اس وقت وہ مناسب دواؤں کے ذریعہ طبیعت کی مدد کرے۔ حکیم علی نے اکبر کے علاج میں اسی اصول علاج کی پیروی کی۔ حکیم علی سے فی الواقع جو غلطی سرزد ہوئی وہ یہ کہ اس نے اسہال کی نوعیت کو نہیں سمجھا جس کی وجہ سے علاج میں تاخیر ہوگئی۔ حکیم علی نے اسے عام اسہال پر قیاس کیا جس سے بالعموم مریض کو کوئی خطرہ لاحق نہیں ہوتا لیکن راقم کا قیاس ہے کہ وہ اسہال جرثومی تھا۔ اس قسم کے اسہال میں علاج میں معمولی تاخیر سے طرح طرح کی پیچیدگیاں پیدا ہو جاتی ہیں جیسا کہ اکبر کے ساتھ پیش آیا۔ بہرحال یہ تشخیص کی غلطی تھی اور اس طرح کی غلطی کا صدور بڑے سے بڑے طبیب حاذق سے ہو سکتا ہے۔[۳۱]

مذکورہ اقتباس میں مولف اکبرنامہ نے حکیم علی کی ایک دوسری غلطی کی طرف بھی اشارہ کیا ہے جو اس سے علامہ شاہ فتح اللہ شیرازی کے علاج میں سرزد ہوئی۔ آیئے اس کی حقیقت بھی دیکھ لی جائے۔

شاہ فتح اللہ شیرازی کا علاج اور حکیم علی

شیخ ابوالفضل نے شاہ فتح اللہ شیرازی کی بیماری کا حال بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ بادشاہ خود عیادت کے لیے گئے اور تسلی دی، چاہتے تھے کہ ساتھ لے کر چلیں لیکن ضعف کی وجہ سے ممکن نہ ہو سکا اسلیے بادشاہ تو کابل کی طرف روانہ ہو گئے لیکن علاج کے لیے حکیم حسن کو چھوڑ گئے۔ اس لیے کہ حکیم علی کی رائے میں خطا معلوم ہوئی۔[۳۲]

مولف اکبرنامہ کے اس بیان سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ حکیم علی کی تشخیص صحیح نہ تھی جسے مولف مذکور نے رائے کی غلطی سے تعبیر کیا ہے۔ لیکن ملا عبدالقادر بدایونی

نے اس رائے کی غلطی کو "خورانیدن ہریسہ" سے جوڑ دیا ہے، لکھتے ہیں:[۳۳]

"وہاں نسبت تلمذ کہ بشاہ فتح اللہ شیرازی داشت او را در تپ محرقہ ہریسہ غذا فرمود و بسیاف اجل سپرد"	حکیم علی نے شاہ فتح اللہ شیرازی کو نسبت تلمذ کے باوجود تپ محرقہ میں ہریسہ بطور غذا تجویز کر دیا اور یوں اسے موت کے سپرد کر دیا۔

مذکورہ بیان کے ساتھ وہ بیان بھی ملاحظہ فرمالیں جو ملا صاحب نے شاہ فتح اللہ شیرازی کے ذکر میں اس کی علالت سے متعلق لکھا ہے:[۳۴]

"دریں ایام علامۂ عصر شاہ فتح اللہ شیرازی در کشمیر تپ محرقہ پیدا کرد و چوں خود طبیب حاذق بود معالجہ نجر دنی ہریسہ نمود ہر چند حکیم علی در آں ایام منع می کرد ممتنع نہ شد و متقاضی اجل گریباں گیر او گشتہ کشاں کشاں بہ دارالبقا برد"	ان دنوں میں علامۂ زماں شاہ فتح اللہ شیرازی کشمیر میں تپ محرقہ میں مبتلا ہوا۔ خود طبیب حاذق ہونے کے باوجود ہریسہ سے علاج کیا۔ ہر چند حکیم علی نے منع کیا لیکن نہ مانا۔ آخر کار فرشتۂ موت اسکا گریباں پکڑ کر کھینچتا ہوا دارالبقا کو لے گیا۔

دونوں بیانات میں جو تضاد ہے وہ بالکل واضح ہے۔ ایک جگہ ملا صاحب لکھتے ہیں کہ شاہ فتح اللہ شیرازی کے لیے ہریسہ[۳۵] حکیم علی نے تجویز کیا تھا اور بقول ان کے "بسیاف اجل سپرد" اور دوسری جگہ لکھتے ہیں کہ حکیم علی کے منع کرنے کے باوجود شاہ فتح اللہ نے بطور علاج ہریسہ کھایا۔

دراصل ملا صاحب دونوں افاضل اطباء سے بغض و حسد رکھتے تھے اور

اسی جذبے سے مجبور ہوکر انھوں نے حکیم علی کے ذکر میں لکھا کہ ہریسہ اس نے تجویز کیا تھا اور شاہ فتح اللہ شیرازی کے ذکر میں لکھا کہ اس نے خود اسے بطور علاج کھایا تھا تاکہ دونوں طبیبوں کا ناتجربہ کار ہونا ثابت ہوجائے۔ اس جذبۂ عناد نے انھیں اتنا اندھا کردیا تھا کہ وہ خود اپنی تحریر کے تضاد کو بھول گئے۔

بہرحال یہ ثابت ہوگیا کہ حکیم علی نے شاہ فتح اللہ کو ہریسہ تجویز نہیں کیا تھا بلکہ منع کیا تھا جس کا اعتراف خود ملا صاحب نے بھی کیا ہے۔ یہاں ہم یہ بھی کہیں گے کہ خود شاہ فتح اللہ نے ہریسہ کو بطور علاج نہیں بلکہ بطور غذا کھایا ہوگا۔ ہر شخص جانتا ہے کہ بخار کی حالت میں منہ کا مزہ بہت خراب ہوتا ہے اس لیے مریض مصالحہ دار چیزوں کے کھانے کی خواہش کرتا ہے۔ عین ممکن ہے کہ خواہش و طبیعت سے مجبور ہوکر حکیم علی کے منع کرنے کے باوجود اس نے ہریسہ کھالیا ہو اور "چوں مرگ آید طبیب ابلہ شود" کا مصداق بن گیا۔

عقیدہ و مسلک | حکیم علی کے عقیدہ و مسلک کے بارہ میں ملا عبدالقادر بدایونی نے لکھا ہے:[۳۶]

"علوم شرعیہ اور کتب سنیہ میں مہارت رکھنے کے باوجود مذہب زیدیہ رکھتا ہے اور تشیع میں متشدد واقع ہوا ہے۔"

مولف نزہۃ الخواطر لکھتے ہیں:[۳۷]

"شیخ عبدالنبی سے اہل سنت کی کتابوں کو پڑھا اور اس میں گہری واقفیت بہم پہنچائی لیکن اس کے باوجود زیدی تھا اور تشیع میں غالی واقع ہوا تھا۔"

اخلاق | جہانگیر حکیم علی کے فضل و کمال کا قائل تھا جیسا کہ پہلے لکھا جاچکا ہے لیکن

اس کی سیرت کے بارہ میں اچھی رائے نہیں رکھتا تھا۔ اس کے بیان کے مطابق حکیم صورت کا اچھا لیکن باطن کا برا تھا، اس کے قلب کے مقابلے میں اس کا طرز عمل بہتر تھا، مجملاً وہ ایک برا آدمی تھا۔[۳۸] ملا عبدالقادر بدایونی نے لکھا ہے کہ وہ خود پسند تھا۔[۳۹] مولف نزہۃ الخواطر نے اس خود پسندی کی وجہ اس کے غیر معمولی علم و فضل کو قرار دیا ہے۔[۴۰]

تالیفات | حکیم علی نے درج ذیل کتابیں تالیف کیں:

۱۔ شرح قانون: حکیم علی کی یہ سب سے زیادہ معروف اور قابل تحسین کتاب ہے۔ یہ شیخ بوعلی سینا کی مشہور طبی کتاب "القانون فی الطب" کی عربی شرح ہے جو شرح گیلانی کے نام سے معروف ہے۔ علامہ علاءالدین قرشی کی عربی شرح کے بعد القانون کی یہ دوسری مکمل شرح ہے۔ یہ چار جلدوں میں ہے بعض تذکرہ نگاروں نے حکیم علی پر الزام لگایا ہے کہ اس شرح میں اس کی حیثیت ایک محقق کے بجائے وکیل صفائی کی ہے۔ اس نے تمام اختلافی مسائل میں ابن سینا کی وکالت کی ہے۔ اگر اسے الزام کہا جاسکتا ہے تو پھر قانون کا کوئی شارح بجز قرشی کے اس الزام سے بری نہیں ہوسکتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ شرح گیلانی قانون کے مشکل مقامات کی تشریح و توضیح میں بے حد اہم اور معین کتاب ہے۔ حکیم علی نے بہت سے مقامات پر ابن سینا سے اختلاف بھی کیا ہے مثلاً ابن سینا کے نزدیک اخلاط کا اطلاق ان رطوبات پر ہوتا ہے جو عروق و موعیہ میں محصور ہیں یعنی خون، صفراء، بلغم اور سوداء لیکن حکیم علی گیلانی تمام رطوبات بدن کو اخلاط میں شمار کرتا ہے خواہ وہ رطوبات محمودہ ہوں یا غیر محمودہ۔

۲- بیاض علی گیلانی: حکیم کے معمولات و مجربات کا مجموعہ ہے۔ جس کا نام طبی تذکروں میں مجربات گیلانی یا مجربات علی گیلانی کے نام سے مذکور ہے۔ عربک اینڈ پرشین ریسرچ انسٹی ٹیوٹ ٹونک میں اس کا جو خطی نسخہ ہے اس کا نام مجربات گیلانی ہے۔ یہ ۱۱۵۹ھ کا مکتوبہ ہے، اوراق کی تعداد ۱۳۵ اور خط نستعلیق ہے۔ آصفیہ میں بھی اس کا ایک خطی نسخہ موجود ہے۔

اس بیاض میں روغن دیودار کا مشہور نسخہ بھی موجود ہے جسے حکیم علی گیلانی نے عضلات، مفاصل اور اعصاب کے دردوں کو دور کرنے کے لیے ایجاد کیا تھا۔ روغن دیودار کا یہ نسخہ آج بھی کثیر الاستعمال ہے اور اطباء کے مطب کی زینت بنا ہوا ہے۔

۳- تاریخ الفی: اکبر کے عہد میں اس اہم تاریخی کتاب کی ترتیب و تالیف میں دوسرے علماء و فضلاء کے ساتھ حکیم علی گیلانی بھی شریک تھا، لیکن بعد میں یہ کام تنہا حکیم ملا احمد ٹھٹوی کے سپرد کر دیا گیا تھا۔[۴۲]

اولاد و تلامذہ حکیم علی گیلانی کے لڑکے کا نام عبدالوہاب[۴۳] تھا۔ تلامذہ میں میر محمد ہاشم اور حکیم صدرا قابل ذکر ہیں[۴۴]۔ موخر الذکر نے جہانگیر کے عہد میں مسیح الزماں کا خطاب حاصل کیا[۴۵]۔

وفات حکیم علی جہانگیر کے عہد میں بروز جمعہ ۵ محرم ۱۰۱۸ھ مطابق ۱۶۰۹ء میں فوت ہوا[۴۶]۔

حواشی

۱ مآثر الامراء ج ا ص ۵۶۶ ۲ اکبری دربار کے ایک بلندپایہ طبیب اور عالم دین تھے ۱۵۸۸ء میں فوت ہوئے ۳ منتخب التواریخ ج ۳ ص ۱۶۵ و طبقات اکبری ج ۲ ص ۴۵۲

۴ مآثر الامراء ج ا ص ۵۶۶ ۵ اکبر نامہ ج ۳ ص ۳۸۲ ۶ توزک جہانگیری ص ۶۳ ۷ ذخیرۃ الخوانین ج ا ص ۲۴۵ مولف اکبر نامہ کا بھی یہی بیان ہے، ملاحظہ فرمائیں ج ۳ ص ۴۳۶ ۸ نزہۃ الخواطر ج ۵ ص ۲۸۶ ۹ مآثر الامراء ج ا ص ۵۶۸ ۱۰ توزک جہانگیری ص ۳۲ ۱۱ نزہۃ الخواطر ج ۵ ص ۲۸۶ ۱۲ مآثر الامراء ج ا ص ۵۶۷-۶۸ ۱۳ ذخیرۃ الخوانین ج ا ص ۲۴۲-۴۳ مزید دیکھیں، اکبر نامہ ج ۳ ص ۶۵۱ و مآثر الامراء ج ا ص ۵۷۰ ۱۴ توزک جہانگیری ص ۴۳ ۱۵ علی عادل شاہ کا پورا نام علی بن ابراہیم بن اسماعیل بن یوسف تھا۔ یہ مذہباً شیعہ تھا۔ اپنے والد کے انتقال کے بعد ۹۶۵ھ/۱۵۵۷ء میں تخت حکومت پر بیٹھا۔ نہایت علم دوست اور خود صاحب علم و فضل تھا۔ اس کے دربار میں ارباب علم و فن کی ایک کثیر تعداد جمع ہو گئی تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ اس کے دور میں بیجاپور مدینۃ العلم بن گیا تھا۔ وہ صاحب سیف بھی تھا چنانچہ اس کے عہد میں سلطنت کا رقبہ کافی وسیع ہو گیا تھا۔ ماہ صفر ۹۸۸ھ مطابق ۱۵۸۰ء میں مقتول ہوا۔ ۱۶ مآثر الامراء ج ا ص ۵۶۶ ۱۷ اکبر نامہ ج ۳ ص ۲۶۱ ۱۸ توزک جہانگیری ص ۴۳ ۱۹ ایضاً ص ۵۰ ۲۰ مآثر الامراء ج ا ص ۵۷۰ ۲۱ ذخیرۃ الخوانین ج ا ص ۲۴۴ ۲۲ ایضاً ص ۲۴۳ ۲۳ اکبر نامہ ج ۳ ص ۵۰۵ ۲۴ منتخب التواریخ ج ۲ ص ۲۰۶ ۲۵ ذخیرۃ الخوانین ج ا ص ۲۴۳ ۲۶ ایضاً ص ۲۴۵ و دربار اکبری ص ۱۰۱ ۲۷ مآثر الامراء ج ا ص ۵۷۰ ۲۸ عمل صالح ج ا ص ۳۳ ۲۹ اکبر نامہ ج ۳ ص ۸۳۰-۳۱ ۳۰ اسے قتل کر دیا گیا تھا اور یہ قتل شہزادہ سلیم (جہانگیر) کے اشارے پر ہوا تھا۔ ۳۱ ذخیرۃ الخوانین میں اکبر کی بیماری کی جو تفصیل ملتی ہے اور جسے ہم پہلے بیان کر چکے ہیں وہ ہمارے نزدیک دو وجوہ سے صحیح نہیں ہے، ایک تو یہ کہ کسی دوسرے مورخ نے اس کا ذکر نہیں کیا ہے، دوسرے یہ کہ اس سے حکیم علی کی بے دانشی ظاہر ہوتی ہے اور یہ معاصر محدثین کے بیانات

کی روشنی میں ثابت ہو چکا ہے کہ وہ غیر معمولی ذہین اور حاذق طبیب تھا۔ ایک طبیب حاذق سے یہ توقع نہیں کی جا سکتی ہے کہ وہ دست کو روکنے کے لیے ایک ایسی تیز قابض دوا استعمال کرے گا جس کی تاثیر کا یہ عالم ہو کہ اس سے آبخورے کا پانی منجمد ہو جائے [۳۲] دربار اکبری

[۳۳] ص ۳۶۸ منتخب التواریخ ج ۳ ص ۱۶۷ [۳۴] ایضاً ج ۲ ص ۳۶۹ [۳۵] ہریسہ ایک غذا ہے جو مرغ یا بکرے کے گوشت اور گیہوں (مقشر) کو ملا کر بناتے ہیں۔ دیکھیں مخزن الادویہ (اردو ترجمہ) ص ۶۳-۲۶۲ [۳۶] منتخب التواریخ ج ۳ ص ۱۶۶ [۳۷] نزہتہ الخواطر ج ۵ ص ۲۸۵ [۳۸] توزک جہانگیری ص ۴۲ [۳۹] منتخب التواریخ ج ۳ ص ۱۶۶ [۴۰] نزہتہ الخواطر ج ۵ ص ۲۸۵ [۴۱] منتخب التواریخ ج ۲ ص ۳۱۹ [۴۲] جہانگیر نے توزک میں لکھا ہے کہ عبدالوہاب نے لاہور کے سادات کے خلاف دعویٰ کیا کہ اس کے والد نے ان کے پاس ۸۰ ہزار روپیے بطور امانت رکھے تھے مگر اب یہ دینے سے انکار کر رہے ہیں۔ سادات نے حکیم کو جھوٹا قرار دیا۔ جہانگیر نے پہلے معتمد خاں کو تحقیق پر مامور کیا بعد میں معاملے کی پیچیدگی کو دیکھتے ہوئے آصف خاں کو تحقیق کا حکم دیا۔ تحقیق سے معلوم ہوا کہ حکیم عبدالوہاب واقعی جھوٹا تھا۔ اس واقعہ کی وجہ سے وہ جہانگیر کی نظر میں گر گیا اور اس کا منصب اور جاگیر دونوں چھین لیے گئے۔ (دیکھیں، توزک جہانگیری ص ۳۰۶ [۴۳] بادشاہ نامہ ج ۲ ص ۳۴۸ [۴۴] توزک جہانگیری ص ۴۲ [۴۵] ایضاً و نزہتہ الخواطر ج ۵ ص ۲۸۶۔

حکمائے اسلام

از

مولانا عبدالسلام ندوی مرحوم

قیمت حصہ اول ۵۰ روپیے　　قیمت حصہ دوم ۴۰ روپیے۔

اخبار علمیہ

شہاب الدین احمد بن ماجد النجدی، پندرہویں صدی عیسوی کا مشہور عرب جہازراں ہے علوم البحر میں اس کی کئی کتابیں ہیں جن میں کتاب الفوائد فی اصول علوم البحر والقواعد زیادہ اہم ہے، اسے شعر و ادب کا بھی ذوق تھا، اس کی تصنیفات و رسائل کی تعداد ۳۰ سے زیادہ بتائی جاتی ہے، عرصہ ہوا اس کے بعض اہم رسالے روسی اور فرانسیسی زبانوں میں تھیوڈور شوموسکی اور سوواجے (SAUVAGET) نے روس اور فرانس سے شایع کیے تھے، اب مرکز الدراسات والوثائق راس الخیمہ کے ابراہیم الخوری نے ابن ماجد کو اپنی کاوش و تحقیق کا خاص موضوع بنایا ہے، چنانچہ گذشتہ سال انھوں نے کتاب الفوائد کو موجودہ معیار کے مطابق اپنے قیمتی حواشی کے ساتھ شایع کیا اور ابن ماجد کے حالات میں بھی ایک کتاب شایع کی۔ علاوہ ازیں اس کے اشعار و قصائد کو تحقیق و تحشیہ کے ساتھ 'احمد بن ماجد، شعرہ الملاحی' الاراجیز والقصائد کے نام سے شایع کیا، اسی سال دمشق کے المعہد الفرنسی سے بھی ابراہیم الخوری کی الشعر الملاحی عند احمد بن ماجد کے نام سے شایع ہوئی، دمشق کی وزارت ثقافت نے لسان الدین ابن الخطیب کی شرح رقم الحلل فی نظم الاول مرتبہ عدنان درویش کو بھی گذشتہ برس بڑے سلیقہ سے شایع کیا اس سے پہلے اسی ادارہ نے نواب صدیق حسن خاں قنوجی بھوپالی کی ابجد العلوم مرتبہ عبدالجبار زکار کا تیسرا حصہ بھی شایع کیا تھا۔

علامہ حافظ ابن حجر عسقلانی نے اپنی مشہور شرح فتح الباری میں خواب کی تعریف، رویائے صادقہ، رویائے صالحہ، رویائے مکروہہ اور حلم و رویا کے فرق وغیرہ پر بڑی مفید و دلچسپ بحث کی ہے، رویت باری اور رویت رسول اللہ ﷺ وغیرہ پر مفسرین و محدثین کے آراء و نظریات کو بھی اس میں پیش کیا گیا ہے، اب قاہرہ کے مکتبۃ التراث الاسلامی نے اسے مستقل کتابی شکل میں الرؤیٰ والاحلام فی ضوء الکتاب والسنۃ کے نام سے شایع کر دیا ہے۔

یورپ میں ادھر جن ادبی و افسانوی کتابوں کا شدت سے انتظار تھا ان میں اشمائیل (ISHMAEL) نامی ناول بھی ہے، یہ نسبتاً ایک کم معروف ادیب ڈینیل کوئن کی کاوش ہے لیکن اسے دنیا کا سب سے بڑا نقد ادبی انعام یعنی پانچ لاکھ ڈالر کا ٹرنر ٹومارو ایوارڈ حاصل ہوا ہے، ناول کا محور ایک انسان اور ایک بندر کے درمیان ماحولیات اور انسان کے متعلق فلسفیانہ گفتگو ہے، ۵۸ ملکوں کی ۲۵۰۰ کتابیں اس انعام کی امیدوار تھیں، اشمائیل نے انعام تو حاصل کر لیا لیکن مختلف ادبی حلقوں میں اس کی واقعی اہلیت زیر بحث ہے، خود ایک جج نے کہا کہ یہ ناول اتنے بڑے انعام کا مستحق معلوم نہیں ہوتا۔

مشرقی یورپ میں کمیونزم کے آہنی حجاب کے اٹھ جانے کے بعد سیاسی، سماجی اور ثقافتی تبدیلیوں کے آثار صاف نظر آنے لگے ہیں، اس خطہ کے شعر و ادب اور سائنسی علوم کے رخ کے بارے میں ایک سوال کا جواب زیکوسلواکیہ کے مشہور شاعر سائنسداں میروسلیو ہولب نے ٹائمز لٹریری سپلیمنٹ کے ایک انٹرویو میں دیا کہ گذشتہ زندگی کا تجربہ بہرحال اہل قلم کے شعور میں رہے گا اور اس کا

عکس نئی نسل میں بھی ظاہر ہو کر رہے گا، ادیبوں اور شاعروں کی تحریروں پر حکومت کی نگرانی اور گرفت کے مثبت پہلو سے انکار نہیں کیا جا سکتا، لیکن اب بعض اہل قلم کی یہ کشمکش مضحکہ خیز ہے کہ وہ اعصابی الجھن اور حکومت کے جبر کے بغیر کیسے لکھ سکیں گے، کیونکہ جدید تبدیلیاں اور تغیرات زمانہ خود نئی کشاکش اور نئے تقسیم عمل کو سامنے لاتے ہیں، انھوں نے اعتراف کیا کہ مشرقی یورپ کی سائنس تکنیکی طور پر الگ تھلگ ہو جانے کی وجہ سے پیچھے ہو گئی، مزید برآں معمولی صلاحیتوں والے سائنسدانوں کا غلبہ رہا، انھوں نے کہا کہ اسباب و سامان درآمد کیے جا سکتے ہیں، نتائج بھی باہر سے حاصل کیے جا سکتے ہیں، لیکن سائنسی فکر درآمد نہیں کی جا سکتی۔

کمیونسٹ چین نے جب چنگیز خاں کو منگولیا کی تاریخ سے جدا کر کے اپنے ملک کا قومی ہیرو قرار دیا تو باہر کی دنیا کو تعجب ہوا لیکن خود چین کے عوامی عزم و حوصلہ کو بہرحال تقویت ملی، اور اب اس کے نتیجہ میں تبت کے رزمیہ ہیرو شہر خاں (GESARKHAN) کا بھی احیاء ہو رہا ہے، اس بادشاہ کا عہد حکومت ۱۲۷۱-۱۳۶۸ء بتایا جاتا ہے، اس وقت چین میں یوآن حکمراں تھے، شہر خاں نے تبت کو فتح کرنے کے بعد متحد کیا، تاریخی اعتبار سے وہ چنگیز خاں ۱۱۶۲-۱۲۲۷ء اور تیمور لنگ ۱۳۳۵-۱۴۰۵ء کے درمیان ہوا، تبت کی سوشل سائنسز اکادمی نے لوک گیتوں، قدیم شاعری اور مخطوطات کی مدد سے چار جلدوں میں شہر خاں کا شاہنامہ تیار کیا ہے اس سے تبت کی ۷۵۰ سال قبل کی تاریخ، زبان، ادب، رسوم، مذہب، لباس اور موسیقی وغیرہ کی مکمل تصویر سامنے آجاتی ہے۔

قدیم فلسفہ و ثقافت کے احیاء کی سعی و کوشش میں اور ملکوں کے ساتھ ہندوستان بھی شریک ہے، جہاں ہندو مذہب و فلسفہ کی علمبردار احیائیت پسند بعض جماعتوں کا رویہ زیادہ شدید و تند ہے، بی، جے، پی اور اس کے نقش اول جن سنگھ کا شمار ان ہی میں ہے، کیمبرج یونی ورسٹی پریس سے بروس گراہم کی ایک کتاب 'ہندو نیشنلزم اینڈ انڈین پالیٹکس؛ اوریجن اینڈ ڈیولپمنٹ آف دی بھارتیہ جن سنگھ' کے نام سے شایع ہوئی ہے، اس میں آزادی کے بعد ہندو قومیت کا نعرہ دینے والی اس جماعت کے نشو ونما اور عروج و ارتقا کا عمدہ طور پر جائزہ لیا گیا ہے، جن سنگھ اور کانگریس کے تعلقات کی نوعیت' ہندو قومیت کے پرکشش نعرہ کے باوجود ۳۰-۳۵ برس تک اقتدار سے محرومی اور کانگریس کے برسر اقتدار رہنے کے اسباب و عوامل کا تجزیہ بھی کیا گیا ہے' قومیت کی حمایت میں جن سنگھ کی انگریزی دشمنی کا تو ذکر ہے لیکن اس کی مسلم بیزاری جیسے بڑے سبب کو مصنف نے نظر انداز کر دیا ہے اور یہ یقیناً حیرت انگیز ہے، ۲۸۳ صفحات کی اس کتاب کی قیمت، ۲۷ پونڈ ہے۔

ملک کے بڑے انگریزی اخباروں میں بعض اہل قلم ہندوستانی قومیت کے بحران کو ہندو قومیت کے بحران سے تعبیر کرتے ہیں، اس طرز فکر کے رد و ابطال میں بعض منصف مزاج غیر مسلموں کے مراسلے بھی شایع ہوتے رہتے ہیں، حال ہی میں ٹائمز آف انڈیا میں ایک مراسلہ نگار ویراچند ہونے لکھا کہ قومیت کو مذہبی تشخص کے ہم پلہ قرار دینے کی کوشش سطحی اور اوچھی ہے، برطانوی استعمار کے خلاف قومیت کا مطلوب و مقصود ہندوستان کے عہد رفتہ کی عظمت و سطوت کی بازیابی تھی، نیز مکمل سماجی انقلاب کیلئے یہ وسیع تر جد و جہد تھی، یہ مقصد آزادی کے بعد اب تک حاصل نہ ہو سکا ہے آزادی ملی لیکن اسکے وعدے اور مضمرات اب بھی مجہول اور دسترس سے دور ہیں اگر اسکے وعدے کم سے کم حد تک بھی ایفا کیے جاتے تو نصف آبادی کو معقول و مناسب معیار زندگی حاصل ہو جاتا، ہندوستانی قومیت کو ہندو قومیت کے ہم پلہ قرار دینے والے صحافیوں سے کوئی پوچھے کہ کیا ہندو تشخص کا احساس صرف رام مندر کی تعمیر سے ہی وابستہ ہے؟ اگر رام مندر بن جائے تو کیا ایک قومی منصوبہ کا شعور پیدا ہو جائیگا کیا ہماری قومیت اتنی دیوالیہ اور صفر محض ہے کہ ایک مندر کی تعمیر کی ناکامی تشخص کے بحران کی جانب لے جائے گی؟

"ع۔ص"

مطبوعات جدیدہ

مولانا آزاد البم از پروفیسر خلیق احمد نظامی، تقطیع بڑی البم سائز، صفحات ۱۶۹، کاغذ، کتابت، طباعت اعلیٰ درجہ کی، قیمت ۶۷۵ روپیے، ناشر ادارۂ ادبیات دلی ۲۰۰۹، قاسم جان اسٹریٹ دہلی۔

مولانا ابو الکلام آزاد مرحوم نادرہ روزگار اور جامع کمالات شخص تھے، ان کی شخصیت اور گوناگوں کمالات پر بہت لکھا گیا ہے اور ان کی صد سالہ تقریبات کے موقع پر مختلف مفید کتابیں شایع ہوئی ہیں لیکن یہ البم ان سب میں اپنی نوعیت کے لحاظ سے منفرد ہے' جو مولانا کی متنوع اور ہمہ گیر زندگی کا مرقع ہے اس میں انکے خاندان، بچپن، عہد شباب اور شام زندگی کی داستان برمحل تصویروں، شبیہوں اور خاکوں کی مدد سے نہایت خوبی اور جامعیت کے ساتھ پیش کی گئی ہے، اکثر تصویروں کے ساتھ کوئی برمحل اور معنی خیز شعر بھی دیا گیا ہے اس طرح یہ انکی مکمل اور جامع مصور سوانح عمری ہے، فاضل مرتب کا ذوق تحقیق اس سے ظاہر ہے کہ انھوں نے فیروز بخت فقیر محی الدین احمد المکنی بابی الکلام آزاد دہلوی کان اللہ لہ سے ابو الکلام تک کے مختلف مراحل کی سنہ وار نشاندہی کی ہے جس سے مولانا کے نفسیاتی مطالعہ کی راہ آسان ہو گئی ہے، اکثر تصویریں نادر و نایاب ہیں، مولانا کے والد مرحوم کی تصنیفات کے سرورق کی تصویر اور مولانا کی اہلیہ کی ڈائری کے ایک ورق کا عکس بھی شامل ہے، پورا البم محنت، دماغ سوزی، نفاست، خوش ترتیبی اور حسن انتخاب کی وجہ سے قابل دید ہے، ص ۵۱ پر بجائے صحاح کے محاح لکھ دیا گیا ہے۔

دلی تاریخ کے آئینہ میں از پروفیسر خلیق احمد نظامی، تقطیع متوسط، مجلد مع گرد پوش، کاغذ، کتابت، طباعت سرورق دیدہ زیب صفحات ۱۵۲ قیمت ۵۰ روپیے، پتہ: آدم پبلشرز اینڈ ڈسٹری بیوٹرز، ۳۴۴۴ مٹیا محل جامع مسجد دہلی ۶۔

دلی کی دلآویزی، زمانہ قدیم سے چلی آتی ہے، کوروں اور پانڈوں سے اب تک اس کا چپہ چپہ مختلف تہذیبوں کے عروج و زوال کا شاہد اور خصوصاً اسلامی تمدن کے گزرے ہوئے قافلہ کا نقش قدم ہے، قرون وسطیٰ اس کی شان و شوکت کا عہد شباب ہے، اس وقت مقامی تہذیب و تمدن کے علاوہ بیرونی ممالک کی ثقافتی زندگی کا وہاں دل دھڑکتا تھا اور اہل جہاں اسے جنت عدن اور بہشت نظیر سے تعبیر کرتے تھے، پروفیسر خلیق احمد نظامی نے اسی دلی مرحوم کی اجتماعی زندگی کو تاریخ کے آئینہ میں پیش کیا ہے، سنہ ۸۲ء میں انھوں نے دہلی یونیورسٹی میں نظام خطبات کے سلسلہ میں "اوراق مصور" کے زیر عنوان دو مقالے پیش کیے تھے ایک میں عہد سلاطین اور دوسرے میں دور مغلیہ کی دلی کی اجتماعی زندگی کا جائزہ لیا گیا ہے، بعد میں غالب انسٹی ٹیوٹ کے زیر اہتمام انھوں نے غالب کی دلی کے عنوان سے ایک اور مقالہ پڑھا تھا، اب زیر نظر کتاب میں ان تینوں مضامین کو یکجا کر دیا گیا ہے، دلی کی آب و ہوا، شاہی محلات، خانقاہوں، مدرسے، کوچہ و بازار، سرائیں، اسپتال، باغ، حوض، باولیاں، قلعے مکان، صنعت و حرفت، مینا بازار، جشن، تیوہار، قبرستان، شاہوں اور امرا کا علمی و ادبی ذوق اور مشاعروں وغیرہ کا ذکر اس خوبی سے کیا گیا ہے کہ یہ محض اوراق مصور ہی نہیں معلوم ہوتے بلکہ دلی کی گذشتہ زندگی اپنی تمام رعنائیوں کے ساتھ متحرک، چلتی پھرتی نظر آتی ہے، غالب کی دلی میں تفہیم غالب کے کئی نئے زاویے سامنے آتے ہیں، ایک صاحب نظر اور اہل دل مورخ کے قلم نے دلی کی طرح اس کتاب کو بھی زیبائی و دلربائی عطا کی ہے جو تاریخ کے

سیاحوں کے دامن دل کو جگہ جگہ کھینچتی جاتی ہے، صاحب مشارق رضی الدین صغانی کو جو کتابت سے صنعانی لکھ دیا گیا ہے۔

طب اسلامی برصغیر میں، خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری پٹنہ، تقطیع متوسط، کاغذ، کتابت و طباعت اعلیٰ، صفحات ۳۲۵، قیمت ۵۰ روپیے، تقسیم کار، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵۔

خدا بخش لائبریری اپنے نادر و اہم مخطوطات کے لیے ممتاز و مشہور ہے، اس کے ذی علم، لائق اور فعال سربراہ ڈاکٹر عابد رضا بیدار ان مخطوطات سے استفادہ کو عام اور سہل کرنے کے علاوہ برصغیر کے دوسرے کتب خانوں اور ذاتی ذخیروں سے بھی لوگوں کو مستفید کرنے کی مستحسن سعی و کوشش میں لگے ہوئے ہیں اسی غرض سے انھوں نے ہر دوسرے برس مخطوطات پر سمینار کرانے کا پروگرام بنایا ہے اسی سلسلہ میں مارچ سنہ ۸۹ء میں سارک ممالک کے نمائندوں کا ایک جنوبی ایشیائی علاقائی سمینار طب یونانی پر عربی و فارسی مخطوطات کے موضوع پر ہوا تھا، زیر نظر مجموعہ اس سمینار میں پڑھے گئے پرمغز اور مفید مقالات کا مجموعہ ہے اس میں ہندوستان کے مختلف کتبخانوں اور ذاتی ذخیروں خصوصاً دہلی، علی گڑھ، دیوبند، لکھنؤ، ٹونک، پٹنہ اور حیدرآباد کے طبی مخطوطات کا بڑے سلیقہ سے تعارف کرایا گیا ہے، پاکستان میں ذخیرہ برکاتی اور نیشنل میوزیم کے دو وہ اہم مخطوطات کے علاوہ دوسرے اور مخطوطات کا جائزہ لیا گیا ہے، کتاب الفاخر، مسائل حنین بن اسحاق، مجموعہ ضیائی اور کتاب المشجر، رسالہ فی المعالجات، فصول فیض اللہ خانی، رسالہ ارسطاطالیس، تحریم الدخان، اختیارات قطب شاہی، مطبوعہ جامع ابن بیطار کے اغلاط، معالجات بقراطیہ وغیرہ پر پُرازمعلومات مقالات ہیں، کتابوں اور مصنفوں کے اشاریے بھی اختصار، جامعیت اور سلیقہ سے تیار کیے گئے ہیں، شروع میں جناب حکیم عبدالحمید کا باوقار خطبہ صدارت اور دلچسپ گفتار کے زیر عنوان جناب محمود احمد برکاتی کی تحریر معلومات افزا ہے اس میں انھوں نے دہلی کے ایک حکیم طاہر علی خاں کے بارے میں

بتایا ہے کہ انھوں نے مرض جذام پر ۱۸۸۳ء میں انگریزی زبان میں ایک مقالہ لکھا تھا جسے برصغیر کے کسی فرد کی پہلی مطبوعہ انگریزی تحریر قرار دیا جاسکتا ہے۔ مضامین میں بعض اہم مجربات کے نسخے بھی شامل ہیں، لائبریری اس ضخیم طبی انسائیکلوپیڈیا کی اشاعت پر مستحق تبریک و تحسین ہے۔

عصر حاضر کی اسلامی تحریکیں از پروفیسر ڈاکٹر سید احتشام احمد ندوی، تقطیع متوسط، کاغذ، طباعت عمدہ، صفحات ۲۴۰، قیمت ۶۰ روپیے، لائبریری ایڈیشن ۷۵ روپیے، پتہ: فیض المصنفین، علی گڑھ۔

خلافت عثمانیہ کے زوال اور یورپ کی استعماری یلغار کے بعد عالم اسلام کو گوناگوں سیاسی فوجی، مادی، علمی اور نظریاتی مخالفتوں اور چیلنجوں کا سامنا کرنا پڑا، اس کو ان بلاخیز طوفانوں سے نکالنے والے مصلحین و مفکرین امت کی جاں سوزی اور جانفشانی اور عزم و ہمت کی روداد حوصلہ افزا بھی ہے اور سبق آموز بھی، ڈاکٹر سید احتشام احمد ندوی پروفیسر کالی کٹ یونیورسٹی نے اس کتاب میں چند نمایاں اور اہم اسلامی تحریکوں کی داستان مرتب کی ہے ان میں محمد بن عبدالوہاب کی اصلاحی تحریک، شیخ سنوسی اور سید احمد شہید، سر سید، سید جمال الدین افغانی اور مفتی محمد عبدہ کی تحریکوں کے علاوہ تحریک دیوبند، تحریک ندوۃ العلماء، سید رشید رضا کی تحریک المنار، تحریک خلافت، ترکی کی جماعت النور، اخوان المسلمین، تبلیغی تحریک، جماعت اسلامی اور انڈونیشیا کی اسلامی تحریکوں کا تعارف و تجزیہ سلامت روی اور توازن سے پیش کیا گیا ہے، لیکن لائق مصنف کے بعض خیالات مزید محتاج توضیح ہیں، مثلاً "امت اسلامیہ نے مسائل حیات کا اسلامی حل تلاش نہیں کیا" "ملت اسلامیہ میں جتنی اصلاحی تحریکیں وہابی تحریک کے بعد وجود میں آئیں وہ کسی نہ کسی طرح اس تحریک سے متاثر تھیں" ایک جگہ اہل یورپ کی مادی فوجی اور علمی طاقت کی فہرست میں اس کی روحانی قوت کا بھی ذکر ہے، جو مبہم ہے، دوسری جگہ لکھتے ہیں کہ "علمائے اسلام کی بنیادی ثقافت مغربی نہ تھی" یہ بھی غیر واضح ہے کیا دوسرے مسلمانوں کی بنیادی ثقافت مغربی ہے، اسی طرح یہ کہنا بھی عجیب ہے کہ "جدید دور میں اگر پوری قوم دیوبند میں تعلیم پاتی تو دنیاوی نقطۂ نظر سے یہ خود ایک مرض بن جاتا" دیوبند کے بزرگوں کی جدوجہد حریت کو انگریزوں کے خلاف سازش سے تعبیر کرنا مناسب نہیں ہے۔ کتابت کی غلطیاں جابجا ہیں۔

ع۔ص

سلسلۂ سیر الصحابہؓ ۔ ظلمات میں روشنی کے منارے

حصۂ اول (خلفائے راشدین) حاجی معین الدین ندوی: اس میں خلفائے راشدین کے ذاتی حالات و فضائل، مذہبی اور سیاسی کارناموں اور فتوحات کا بیان ہے۔ ۴۰/-

حصۂ دوم (مہاجرین۔ اول) حاجی معین الدین ندوی: اس میں حضرات عشرۂ مبشرہ، اکابر بنی ہاشم و قریش اور فتح مکہ سے پہلے اسلام لانے والے صحابۂ کرامؓ کے حالات اور ان کے فضائل کا بیان ہے۔ ۴۵/-

حصۂ سوم (مہاجرین دوم) شاہ معین الدین احمد ندوی: اس میں بقیہ مہاجرین کرامؓ کے حالات و فضائل بیان کیے گئے ہیں۔

حصۂ چہارم (سیر الانصار اول) سعید انصاری: اس میں انصار کرام کی مستند سوانح عمریاں، ان کے فضائل و کمالات مستند ذرائع بہ ترتیب حروف تہجی لکھے گئے ہیں۔ ۴۵/-

حصۂ پنجم (سیر الانصار دوم) سعید انصاری: اس میں بقیہ انصار کرام کے حالات و فضائل درج ہیں۔ ۳۵/-

حصۂ ششم شاہ معین الدین احمد ندوی: اس میں چار اہم صحابۂ کرامؓ، حضرات حسنینؓ، امیر معاویہؓ اور حضرت عبداللہ ابن زبیرؓ کے حالات، ان کے مجاہدات اور باہمی سیاسی اختلافات بشمول واقعۂ کربلا درج ہیں۔ ۳۵/-

حصۂ ہفتم (اصاغر صحابہؓ) شاہ معین الدین احمد ندوی: اس میں ان صحابۂ کرام کا ذکر ہے، جو فتح مکہ کے بعد مشرف بہ اسلام ہوئے یا اس سے پہلے اسلام لا چکے تھے مگر شرف ہجرت سے محروم رہے، یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں کمسن تھے۔

حصۂ ہشتم (سیر الصحابیاتؓ) سعید انصاری: اس میں آنحضرتؐ کی ازواج مطہرات و بنات طاہرات اور عام صحابیات کی سوانح حیات اور ان کے علمی اور اخلاقی کارنامے درج ہیں۔ ۲۵/-

حصۂ نہم (اسوۂ صحابہ اول) عبدالسلام ندوی: اس میں صحابۂ کرامؓ کے عقائد، عبادات، اخلاق اور معاشرت کی صحیح تصویر پیش کی گئی ہے۔ ۴۰/-

حصۂ دہم (اسوۂ صحابہؓ دوم) عبدالسلام ندوی: اس میں صحابۂ کرامؓ کے سیاسی، انتظامی اور علمی کارناموں کی تفصیل دی گئی ہے۔ ۴۵/-

حصۂ یازدہم (اسوۂ صحابیات) عبدالسلام ندوی: اس میں صحابیات کے مذہبی، اخلاقی اور علمی کارناموں کو یکجا کر دیا گیا ہے ...
[illegible]